جمادی الاولیٰ - رجب المرجب ۱۴۴۲ھ
جنوری - مارچ ۲۰۲۱ء

سہ ماہی

حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصّہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن

صفحات:360، قیمت550 روپے

حصّہ دوم سُورۃ آل عمران تا سُورۃ المائدہ

صفحات326، قیمت 550روپے

حصّہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ

صفحات331، قیمت550روپے

حصّہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف

صفحات394، قیمت600روپے

حصّہ پنجم سُورۃ مَریَم تا سُورۃ السَّجدۃ

صفحات480، قیمت825روپے

حصّہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات

صفحات484، قیمت825روپے

حصّہ ہفتم سُورۃ قٓ تا سُورۃ النّاس

صفحات560، قیمت900روپے

(مکمل سیٹ:4800روپے)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

اعتزال نہیں اعتدال!	ڈاکٹر ابصار احمد	3

رجوع الی القرآن

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور ''بیان القرآن''	ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی	7

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۲۴)	ابو جعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	37

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی و نحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	50

تعلیم و تعلّم

مباحثِ عقیدہ (۲)	مؤمن محمود	67

کتاب نما

تعارف و تبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	80

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعتزال نہیں اعتدال!

ڈاکٹر ابصار احمد

دوسری صدی ہجری کے اوائل میں فرقہ معتزلہ معرضِ وجود میں آیا۔ اس فرقے کا بانی واصل بن عطاء الغزال تھا اور اس کا سب سے پہلا پیروکار عمرو بن عبید تھا' جو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد تھا۔ ان لوگوں کو اہلِ سُنّت والجماعت کے عقائد سے الگ ہوجانے کی بناء پر 'معتزلہ' کہا جاتا ہے۔ معتزلہ کے مذہب کی بنیاد عقل پر ہے کہ ان لوگوں نے عقل کو نقل پر ترجیح دی' عقل کے خلاف قطعیات میں تاویلات کرتے' اور ظنیات کا انکار کر دیتے' اللہ تعالیٰ کے اَفعال کو بندوں کے افعال پر قیاس کرتے' بندوں کے اَفعال کے حسن وقبح کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے اَفعال پر حسن وقبح کا حکم لگاتے اور خلق اور کسب میں کوئی فرق نہ کر پاتے۔ ان کے مذہب کے پانچ مشہور اصول ہیں: عدل' توحید' اِنفاذِ وعید' منزل بین منزلتین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔

معتزلہ کے یہ اصول اور ان کی تشریحات عقل وقیاس پر مبنی ہیں۔ ان کے خلاف واضح آیات واحادیث موجود ہیں۔ نصوص کی موجودگی میں عقل وقیاس کو مقدّم کرنا سراسر غلطی اور گمراہی ہے۔ معتزلہ عقائد میں پختہ' اعمالِ شرعیہ میں متشدّد' روزہ نماز کے سخت پابند اور حج کے عاشق تھے۔ دین کی حفاظت' مخالفوں سے مقابلہ اور اسلامی تعلیمات کے عقلی ثبوت کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ جس مقام پر اس کی ضرورت دیکھتے گرمی یا سردی اور سفر کی مشقتوں کا خیال کیے بغیر پہنچتے۔ زبانوں میں طلاقت تھی' فصاحت میں ممتاز تھے' اور اُس زمانے کے ''عقلی علوم'' سے مسلح تھے۔ اس لیے بحثوں میں غلبہ حاصل کرتے۔ ملحدوں' دہریوں اور دیگر اہل مذاہب کی تردید اور اور اپنے عقائد کے اثبات میں کتابیں اور رسالے لکھتے' اور مجامع اور مجالس میں دین کی حمایت میں تقریریں کرتے' جو دلنشین اور بلیغ ہوتیں۔ غیر مذاہب کے مجادلوں پر ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ زہد وتقویٰ اور اخلاق وعادات کے لحاظ سے اس قدر مقبول تھے کہ جہاں جاتے کثیر تعداد میں لوگ ان کے ساتھ ہو جاتے۔ اُمّت کی ہدایت اور رہنمائی یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر ان کے اصول میں داخل تھی' جس کے لیے اپنے آپ کو ''وقف'' سمجھتے تھے۔ معتزلی عقائد کے ردّ میں اہلِ سُنّت کے ائمہ کرام کو اللہ تعالیٰ اجرِ عظیم عطا فرمائے کہ انہوں نے معتزلی گمراہیوں کا پردہ چاک کیا اور دین کے اصل متوازن اور معتدل موقف کو علم ودانش اور عقل ونقل کی ہر سطح پر قائم وسربلند رکھا۔

میرا احساس ہے کہ عصر حاضر میں وارثانِ علمِ نبوت کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ اہلِ سُنّت کے معتدل و متوازن موقف کی صحیح طور سے نمائندگی ہو۔ راقم نے فلسفیانہ اور منطقیانہ بحثوں کی تنقیح میں ایک عمر صرف کی ہے'

لیکن اسے اپنی کم علمی کا پورا اعتراف ہے کہ اسے اس کبر سنی میں اہل سُنّت کے یہاں پائی جانے والی معتدل اور مدلّل کلامی بحثوں سے کچھ تعارف جو حالیہ دنوں میں ہی حاصل ہوا ہے‘ وہ راقم کے اعتماد اور انبساط کا موجب ہوا ہے۔ عدم اعتدال صرف فرقِ ضالہ ہی کا وصف نہیں ہے‘ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں خارجی حالات کا دباؤ راہِ اعتدال سے ہٹانے کا سبب بن جاتا ہے۔ بعض متداول حلقوں کے بارے میں ایک تاثّر یہ ہے اُن میں دین کی سخت گیری کا جو تصوّر پیش کیا جاتا ہے‘ اس میں ہمارے صحیح حدیثی لٹریچر میں وارد دین میں آسانی‘ کشادگی اور خوش خبری و بشارت کے پہلو سے صرفِ نظر (overshadowed) ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے‘ جس سے بہت سے کم ہمت اور وسائل نہ رکھنے والے کلمہ گو حضرات وخواتین میں حوصلہ اور اُمید کی کرن پیدا ہوگی اور وہ راہِ حق میں پیش قدمی کی کوشش کریں گے۔ نصِ قرآنی انتہائی چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے اجر ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝﴾ (الزلزال) کی صراحت کرتی ہے۔ اسی طرح: ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ (البقرۃ:۲۱۵) ”اور تم جو بھلائی بھی کرو گے‘ بلاشبہ اللہ اُسے جاننے والا ہے“۔ سورۃ البقرۃ ہی میں فرمایا: ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ (آیت ۱۹۷) ”تم جو بھی بھلائی کرتے ہو‘ اللہ اُسے جانتا ہے۔“ سورۃ الحج کے آخری رکوع کی آیت ۷۸ کا ٹکڑا ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ ”اور تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں ڈالی“ یعنی ایسا حکم نہیں دیا جس کا متحمل نفس انسانی نہ ہو۔ ورنہ تھوڑی بہت محنت و مشقّت تو ہر کام میں ہی اٹھانی پڑتی ہے۔ پچھلی شریعتوں کے بعض سخت احکام بھی اُس نے منسوخ کر دیے۔ علاوہ ازیں بہت سی آسانیاں مسلمانوں کو عطا کر دیں‘ جو پچھلی شریعتوں میں نہیں تھیں۔ (ترجمہ وتشریح: مولانا صلاح الدین یوسفؒ)

ایک حدیث میں دین اسلام کو ”الحنيفية السّمحة“ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب دین حنیفیت ہے جو بہت سہل اور آسان ہے“۔ صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں ایک علیحدہ باب (نمبر ۲۹) ”دین آسان ہے“ کے عنوان سے ہے‘ جس میں یہ حدیث قابلِ توجّہ ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ ، وَلَنْ يُّشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَأَبْشِرُوا ، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ))

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی مکرّم ﷺ نے فرمایا: ”بے شک دین آسان ہے‘ اور جو کوئی دین میں سختی پیدا کرے گا تو دین اُس پر غالب آجائے گا۔ اس لیے راست روی اختیار کرو‘ میانہ روی اختیار کرو‘ امیدِ ثواب سے شاد و مطمئن رہو‘ صبح و شام اور قدرے آخر شب میں مدد مانگتے رہو۔“

اس context میں احادیث مبارکہ کے مقبول ترین مجموعے ’ریاض الصالحین‘ کا ایک باب بھی بہت اہمیت رکھتا ہے‘ جس کا عنوان ہے ’باب فی بیان کثرۃ طرق الخیر‘ یعنی اس بات کے بیان میں کہ نیکی اور بھلائی کے راستے بہت ہیں۔ بالفاظِ دگر ان کا ایک وسیع دائرہ (spectrum) ہے۔ اس باب کی متعدد احادیث میں سے راقم حضرت اَبوذرّ جندب رضی اللہ عنہ کی ایک متفق علیہ روایت کا ترجمہ یہاں دے رہا ہے۔

حضرت ابوذر جندب بن جنادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں' مَیں نے کہا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کے راستے میں جہاد کرنا''۔ مَیں نے کہا' کون سا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو اپنے مالک کی نظروں میں سب سے عمدہ اور زیادہ قیمتی ہو''۔ میں نے کہا' اگر مَیں یہ نہ کرسکوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کسی کاریگر کی مدد کردو یا بے ہنر کا کام کردو''۔ مَیں نے کہا' یارسول اللہ' یہ بتلائیں اگر مَیں یہ بعض عمل کرنے سے بھی عاجز رہوں؟ فرمایا: ''تم لوگوں کو اپنے شر سے بچائے رکھو' یہ بھی تمہارا اپنے نفس پر صدقہ ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استفسار کرنے والے صحابی کو ''تم میں کوئی خیر نہیں!'' یا "you are a gone case" وغیرہ کہہ کر discourage نہیں کیا' بلکہ نیکی اور بھلائی کو نیچے لاتے لاتے دوسروں کو ایذا پہنچانے سے اجتناب کو بھی اجر میں صدقہ واحسان سے کم نہیں کہا۔ تسبیح' تحمید اور تہلیل کے کلمات کو ادا کرنے کو بھی صدقہ قرار دیا۔ راستے سے تکلیف دہ چیز کے ہٹانے کو اچھے اور خیر کے کام میں شمار کیا۔ اپنے مسلمان بھائی سے خندہ روئی سے ملنا بھی نیکی اور کسی آدمی کو سواری پر بٹھانے یا اُس کا سامان اٹھا کر اس پر رکھوانے میں مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ متعدد احادیث کی طرح جمع خاطر' خوشخبری اور بشارت کا پہلو بھی حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی مسلم کی ایک حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ صَلّٰی صَلاۃَ الْفَجْرِ فَھُوَ فِیْ ذِمَّۃِ اللّٰہِ)) ''جس نے صبح کی نماز پڑھی وہ اللہ کی حفاظت اور عہد میں ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور عہد سے بڑھ کر ایک بندۂ مؤمن اور کس چیز کا طالب ہوسکتا ہے' کہ اُس کی ہر بات اور حقوق کو پامال کرنے والے سے اللہ خود باز پرس کرے گا۔

راقم کو اپنی کم علمی اور ممکنہ ذہنی کجی کا پورا اعتراف ہے' لیکن پورے خلوص کے ساتھ قلب و ذہن میں لمبے عرصے کے دوران اُترے گہرے ذاتی خیالات قلمبند کر رہا ہے۔ برادرِ محترم مؤسس انجمن خدّام القرآن اور بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کو واصل برحمتِ حق ہوئے گیارہ سال ہونے والے ہیں۔ جہاں ایک طرف ان کے ذکی الحس' بیدار شعور' دقیقہ رس' نکتہ سنج اور ژرف نگاہ ہونے کو بہت سے فضلاء اور علماءِ کرام نے تسلیم کیا ہے اور قرآن حکیم کے داعی کی حیثیت سے انہیں بجا طور پر نمایاں مقام دیا ہے' بہت سے مخلصین دین نے ان کی بعض تفسیری آراء اور فکری مواقف سے اختلاف بھی کیا ہے۔ راقم اپنی علمی بے بضاعتی کے باوصف یہ سمجھتا ہے کہ ان کے فکر کے بعض فراموش کردہ پہلوؤں کی جانب التفات کر کے ہم ان کے فکر اور مشن کو زیادہ روشن اور توانا (powerful) بنا سکتے ہیں۔ بحمدِ اللہ اسلامی ذہنیت میں جو بیداری اُن کے دروسِ قرآن' موضوعاتی تقاریر اور لٹریچر نے پیدا کر دی تھی اور جس علمی حرکت کو وہ اکسا گئے تھے اسے کوئی طاقت بارآور ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اس احیائی دینی فکر کو سطحیت اور جمود کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے گہری دینی عرفانی بصیرت کے ساتھ عصر حاضر کے علمی و عقلی سطح کی ایسی تازگی و توانائی (rejuvenation) کی ضرورت ہے جو معاصر گلوبل حالات و افکار کا گہرا فہم و ادراک بھی رکھتی

ہو۔ اور اس سلسلے میں انجمن اور قرآن اکیڈمی کو صدر مؤسس کی خواہش کے عین مطابق اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ایک ریسرچ اور تدریسی ادارے کے طور پر علمی ممارست وفقاہت اور فکری تدوینِ نو کا کام کرنا ہے۔ یہ ہدف مشکل تو ضرور ہے، لیکن اس کی ضرورت ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

تنقیح وتنقید کی اہمیت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ جماعت اسلامی حصّہ دوم میں اس طرح بیان کی ہے:

> ''اجتماعی زندگی کے لیے اخلاقی حیثیت سے تنقید کی وہی اہمیت ہے جو مادّی حیثیت سے صفائی کی ہے ..... تنقیدی نگاہ سے خرابیوں کو دیکھنے والی آنکھیں، بیان کرنے والی زبانیں اور سننے والے کان اگر بند ہوجائیں تو جس قوم، سوسائٹی یا جماعت میں یہ حالت پیدا ہوگی، وہ خرابیوں کی آماجگاہ بن کر رہے گی اور پھر اس کی اصلاح کسی طرح نہ ہوسکے گی۔''

اس موضوع پر مؤسّس انجمن ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بھی سورۃ العنکبوت آیت ۲۵ کی تشریح میں دِقت نظر اور تفصیل سے جو کچھ رقم کیا ہے وہ بہت اہم اور چشم کشا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اس کا وہ جامع و مانع وضاحتی بیان جو گزشتہ حکمتِ قرآن (اکتوبر، دسمبر ۲۰۲۰ء) کے 'حرفِ اوّل' میں تحریر ہوا ہے، کا مطالعہ بنظر غائر کریں۔ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے ایک مختصر لیکن وقیع رسالے میں ان موضوعات پر بالوضاحت لکھا ہے۔ امام غزالی نور اللہ مرقدہ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'احیائے علوم الدین' میں کتاب کے چار حصّوں میں سے پہلے حصے میں علم اور عقیدے کی اہمیت کو بصیرت افروز، عالمانہ اور انتہائی مؤثر انداز میں شرح وبسط سے تحریر فرمایا ہے۔ اس سے مستفاد ایک عالم ربّانی (اغلباً مولانا مناظر احسن گیلانیؒ) کا یہ قول قابلِ توجّہ ہے کہ جو دینی پراجیکٹ مضبوط علمی مقدّمات اور گہری دینی علمیت اور فقاہت پر استوار ہوگا، اس میں داخلی انتشار اور فتنے کے امکان کم ہوں گے۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور کئی دوسرے ثقہ حضرات راوی ہیں کہ مولانا سیّد مودودیؒ نے دینی علوم کے عمیق مطالعے سے قبل تین سال سے زائد عرصہ مغربی فکر وفلسفہ اور جدید مغربی انقلابی تحریکوں کے مطالعے میں صرف کیا اور اس کے کچھ تأثرات ان کے قلب وذہن میں ایسے گہرے اُتر گئے کہ ان کی پوری جماعت متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کے لیے اسلام عصرِ حاضر میں سیاسی ہی نہیں بلکہ تہذیبی چیلنج کے طور پر بھی دیکھا جارہا ہے۔ بلاشبہ جاہلیتِ جدیدہ کا ڈنکا بے شمار نئے وسائل کے ساتھ پوری دنیا پر بج رہا ہے اور اس نے بے حساب مسائل زندگی میں پیدا کردیے ہیں۔ لیکن عالَمِ اسلام کے اسلامسٹس (اسلام پسند دانشوروں) کا یہ خیال محلِ نظر کہ ہمارے متقدمین (علماء وائمہ سلف) نے ان میں ہماری راہنمائی نہیں کی۔ مثال کے طور پر امام غزالیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'احیائے علوم الدین' کی کتابُ العلم میں معلّم اور متعلّم کے وظائف واوصاف جس دِقّتِ نظر اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں پر نظر رکھتے ہوئے کی ہے، وہ آج بھی ہمارے حالات وماحول میں منارۂ نُور ہیں۔ کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مستفاد علوم ہی وہ ماخذ ہیں جن سے اس دور میں تجدیدِ ملّت کا کام کرنے کے لیے راہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ (باقی صفحہ 80 پر)

ڈاکٹر اِسرار احمدؒ اور بیان القرآن

ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی ۞

سوانحی تفصیلات

ڈاکٹر اِسرار احمد کی ولادت ۲۶/اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع حِصار، ریاست ہریانہ، مشرقی پنجاب (بھارت) میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور پنجاب یونیورسٹی میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے فعال کارکن اور مقامی عہدیدار کے طور پر تحریک پاکستان میں بھرپور حصّہ لیا۔ پھر تقسیم ہند کے دوران بڑی مشقت اٹھا کر اور طویل مسافت پیدل طے کر کے پاکستان پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی کی اور ۱۹۵۴ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ میڈیکل کی چار سالہ تعلیم کے دوران اسلامی جمعیت طلبہ کے فعال کارکن سے آگے بڑھتے ہوئے ناظم اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جماعت اسلامی کے باقاعدہ رکن بن گئے، لیکن جماعت سے پالیسی اور طریق کار کے اختلاف کے باعث سوا دو سال بعد علیحدگی عمل میں آ گئی۔ ۱۹۶۵ء میں جامعہ کراچی سے ایم اے (اسلامیات) کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا۔

۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر صاحب منٹگمری (حال ساہیوال) منتقل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء تک حالات میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ دو مرتبہ کراچی نقل مکانی بھی ہوئی۔ لیکن اس پورے عرصے کے دوران درس و تدریس قرآن اور تعلّم و تعلیم قرآن کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحب غلبہ و اقامتِ دین کی جدّ و جُہد کے پختہ ارادے اور تعلّم و تعلیم قرآن کی منظم منصوبہ بندی کے عزمِ مصمّم کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے اور پھر ساری عمر یہی دو کام ان کی زندگی کا مرکز و محور رہے۔ شروع کے پانچ سال تو میڈیکل پریکٹس بھی جاری رہی، لیکن پھر کلینک سے کنارہ کشی کر کے دعوت و اقامتِ دین کی جِدّ و جُہد کے لیے یکسو ہو گئے۔ لاہور منتقل ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے دروسِ قرآن شہر کے کئی علاقوں میں شروع ہو گئے تھے۔ پھر یہ سلسلہ دوسرے شہروں تک وسیع ہو گیا۔ ۱۹۶۸ء میں مسجد خضراء، سمن آباد سے خطاباتِ جمعہ کا بھی آغاز ہو گیا جو بعد میں مسجد دارالسلام،

۞ اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو، علی گڑھ

باغِ جناح میں منتقل ہوگیا۔

۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ بعدازاں غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے لیے ۱۹۷۵ء میں ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے ایک اسلامی انقلابی جماعت وجود میں آئی۔ مرکزی انجمن خُدّام القرآن اور تنظیم اسلامی کے زیراہتمام تعلّم وتعلیم قرآن اور غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے لیے وسیع پیمانے پر سرگرمیاں جاری رہیں۔ لاہور' کراچی اور ملک کے دیگر شہروں میں قرآن کالج' قرآن اکیڈمیز اور دیگر ادارے قائم کیے گئے۔ دعوتِ قرآنی کے فروغ کے لیے قرآن کانفرنسز' محاضراتِ قرآنی اور دیگر اجتماعات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

۲۰۰۴ء کے اواخر میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دعوت پر ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بھارت کا ایک ماہ پر محیط دورہ کیا۔ اس دورہ کا مرکزی پروگرام ممبئی میں تھا' جہاں پر مسلسل دس دن تک ایک ہی میدان میں لیکچرز ہوئے۔ ان لیکچرز میں حاضرین کی روزانہ تعداد دس سے پندرہ ہزار نفوس تک ہوتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی حیاتِ مستعار ہی میں طویل مشاورتی عمل کے بعد اپنے بیٹے حافظ عاکف سعید صاحب کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ ۲۰۰۲ء میں خرابی صحت کی بنا پر ڈاکٹر صاحب تنظیم کی امارت سے سبکدوش ہوئے تو یہ ذِمّہ داری حافظ عاکف سعید صاحب کو منتقل ہوگئی اور ڈاکٹر صاحب نے خود بھی حافظ عاکف صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

ڈاکٹر صاحب کا انتقال ۱۳ اور ۱۴ اپریل ۲۰۱۰ء کی درمیانی شب کو ہوا۔

فکری ارتقاء

ڈاکٹر اسرار احمد کی زندگی کا ایک اہم موڑ اسلامی جمعیت طلبہ کی اعلیٰ قیادت پر فائز ہونے کے بعد جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کرنا' مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے افکار وخیالات سے متفق ہونا اور پھر شعوری طور پر اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر درج ذیل کتابیں لکھیں :

(۱) تحریک اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ

(۲) مولانا مودودی مرحوم اور میں

(۳) تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ کے مقام تک پہنچ کر انہوں نے افکارِ سیّد مودودیؒ کی توسیع وتشہیر میں سرگرم حصّہ لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا مودودی نے سورۂ یوسف کی جو تفسیر لکھی' اس نے انہیں موصوف کا عاشق بنا دیا۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں میڈیکل کی تعلیم سے فراغت کے بعد اسلامی جمعیت طلبہ کی ذِمّہ داریوں کو چھوڑ کر وہ رکن جماعت بنائے گئے لیکن ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے واضح اختلافات کی بنیاد پر مستعفی ہوکر ملک گیر سطح پر ایک اسلامی انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے کوشاں ہوگئے۔ ان کا واضح نقطہ نظر یہ تھا کہ جماعت اسلامی تقسیم ہند سے قبل ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت تھی' جبکہ انتخابی سیاست میں قدم رکھنے کی وجہ سے جماعت کا رخ

تبدیل ہو گیا ہے۔ پہلے ہماری ترجیح افراد کی ذہن سازی، تطہیرِ افکار، تزکیۂ نفس اور تعمیرِ سیرت تھی۔ اب ہمارا رخ حکومت پر تنقید اور نظامِ حکومت کی اصلاح کی جانب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تجزیہ کے لیے بطور دلیل جماعت کے اکابرین کی ۱۹۴۷ء سے قبل اور ۱۹۴۷ء کے بعد لکھی جانے والی تحریروں کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا۔ انہوں نے جماعت کی اصلاح کے لیے جو تجاویز رکھیں، جماعت کی اعلیٰ قیادت نے غور وخوض کے بعد ان کے مطابق اپنی حکمت عملی بنانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد جماعت سے مستعفی ہو گئے۔ ان کے اعتراضات کی بنا اس بات پر بھی تھی کہ تقسیم ہند کے بعد اس تحریک کے اندر پیدائشی مسلم اور شعوری مسلم کی شناخت کا پہلو کمزور ہو گیا۔ دوسری طرف تقسیم کے بعد غیر مسلموں تک دعوت دین کو پہنچانے کا عمل ختم ہو گیا۔ چنانچہ جماعت اسلامی بس ایک قومی سیاسی جماعت بن کر رہ گئی ہے۔ (۱)

۱۹۵۷ء میں جن حضرات نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی ان میں مولانا امین احسن اصلاحی (و:۱۹۹۷ء)، مولانا عبدالغفار حسن (و:۲۰۰۷ء) اور حکیم عبدالرحیم اشرف (و:۱۹۹۶ء) بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے رابطوں کے نتیجے میں جون ۱۹۶۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے چند افراد رحیم آباد میں جمع ہوئے اور ایک نئی جماعت کے قیام کے حوالے سے ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی، جسے جولائی ۱۹۶۷ء کے ''میثاق'' میں ''قراردادِ رحیم آباد'' کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ اس کاوش کے نتیجے میں کم وبیش چالیس حضرات کا ایک مشاورتی اجتماع ستمبر ۱۹۶۷ء میں رحیم یار خان میں ہوا اور مذکورہ بالا قرارداد کو اس کی توضیحات سمیت معمولی کمی بیشی کے بعد متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ لیکن ع ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے!'' کے مصداق ایک اجتماعیت کے قیام کا معاملہ بوجوہ آگے نہ بڑھ سکا۔

بعد ازاں جب ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم کی تو مذکورہ ''قراردادِ تاسیس'' ہی کو تنظیم کی اساس کے طور پر اختیار کیا۔ تنظیم اسلامی کے تحت ملک گیر سطح پر فہم دین اور دروس قرآن کے حلقے قائم کیے گئے اور آڈیو ویڈیو کیسٹس اور سی ڈیز کے ذریعہ ڈاکٹر اسرار احمد کے خطبات ودروس کو بڑے پیمانے پر ایک منظّم انداز میں پیش کیا گیا۔ ہفت روزہ تربیتی کیمپوں کے ذریعہ تذکیر اور تطہیر افکار کا پروگرام بنایا گیا۔ تنظیم اسلامی نے ''تجدیدِ ایمان، توبہ وانابت اِلی اللہ اور تجدید عہد'' کی اصطلاحات کو بطور ماٹو اختیار کیا۔ ''مذہب اسلام'' کے بجائے ''دینِ اسلام'' کی اصطلاح کو فروغ دیا گیا۔ رکنیت کے لیے امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر بیعت کو لازمی شرط قرار دیا گیا، کیونکہ مؤسس تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد کا خیال تھا کہ بیعت کا طریقہ ہی سیرتِ نبویؐ سے ثابت ہے۔

''بیان القرآن'' کا تعارف

رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ (۱۹۸۴ء) کے دوران ڈاکٹر صاحبؒ نے قرآن اکیڈمی، لاہور میں نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز کیا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ قرآن کی ہدایت سے آشنا ہوں۔ مزید یہ کہ رات کا طویل حصّہ قرآن کے ساتھ بسر ہو، تاکہ روزِ قیامت قرآن حکیم شرکاء کے حق میں یہ سفارش کر سکے کہ یہ لوگ میری وجہ سے

جاگتے رہے۔ اس پروگرام کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی شرفِ قبولیت بخشا اور ہر سال اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لاہور کے علاوہ کراچی، ملتان، ابوظبی اور امریکہ میں بھی دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ اب ڈاکٹر صاحبؒ کے کئی شاگرد ہیں جو ہر سال خدمتِ قرآنی کی اس سعادت کو پاکستان کے متعدد شہروں میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے کراچی میں دورۂ ترجمہ قرآن کیا جس کی ویڈیو ریکارڈنگ جدید ڈیجیٹل کیمروں کے ذریعے کی گئی۔ یہ ریکارڈنگ Qtv اور کئی دیگر ٹی وی چینلز پر نشر ہوئی اور ۱۲۶ ممالک میں لاکھوں مسلموں اور غیر مسلموں تک قرآن کا پیغام پہنچا۔ بعد ازاں ۱۰۸ گھنٹوں پر مشتمل دورۂ ترجمہ قرآن کی اس ریکارڈنگ کو نہایت محنت ولگن سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا گیا اور ترتیب وتسوید اور تبییض وتدوین کے کٹھن مراحل سے گزار کر کتابی صورت میں پیش کیا گیا۔ ''بیان القرآن'' کے آغاز میں عنوان ''تقدیم'' کے تحت ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنے تعلّم وتعلیم قرآن کے سفر کی بعض تفصیلات بیان کی ہیں۔ قارئین کی دلچسپی اور موضوع کی تفہیم کے لیے اس کا اختصار یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں کہ ہائی اسکول کے زمانہ میں علّامہ اقبال کی شاعری کے ذریعہ عظمتِ قرآن کی اہمیت دل پر نقش ہوگئی تھی۔ بڑے بھائی اظہار احمد مرحوم ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہونے والی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر سورۂ یوسف کے اجتماعی مطالعے اور مذاکرے کراتے، جس نے قرآن کی فصاحت وبلاغت کا نقش دل پر جما دیا۔ تقسیم ہند کے بعد اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی کی رکنیت کے دس سالہ طویل سفر میں درس قرآن کی ذِمّہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا۔

اپنی بابت ڈاکٹر اسرار احمدؒ کہتے ہیں کہ بیس سال کی عمر میں، میڈیکل ایجوکیشن کے عین وسط ہی میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اب یہ طب کی تعلیم بھی اور طبابت کا پیشہ بھی، سب میری ترجیحات میں نمبر دو پر رہیں گے۔ اوّلین ترجیح خدمتِ قرآن اور خدمتِ دینِ متین کو حاصل رہے گی۔ پھر ۱۹۷۱ء میں قمری حساب سے چالیس سال کی عمر میں جب یہ محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل وکرم سے مجھ پر اپنی شانِ ''علّم القرآن'' کے ساتھ ساتھ ''علّمہ البیان'' کا بھی کسی درجے میں فیضان فرما دیا ہے تو اپنے پیشہ طبابت کو بالکل خیر باد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت قرآنِ مبین اور دینِ متین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

''قصہ مختصر، لاہور میں ۱۹۶۵ء سے میرے باضابطہ حلقہ ہائے مطالعہ قرآن قائم ہوئے تو اس کے نتیجے میں پہلے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم ہوئی، جس کی کوکھ سے ذیلی انجمنوں کا ایک سلسلہ برآمد ہوا (کراچی، ملتان، فیصل آباد، جھنگ، کوئٹہ، اسلام آباد، پشاور)۔ پھر ۱۹۷۶ء میں لاہور میں قرآن اکیڈمی قائم ہوئی اور اس کی ''بیٹیوں'' کے طور پر کراچی، ملتان، فیصل آباد اور جھنگ میں بھی اکیڈمیاں وجود میں آئیں۔ ساتھ ہی پاکستان کے طول وعرض میں بڑے بڑے شہروں میں میرے درسِ قرآن کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ پھر قرآنی تربیت

گاہوں (جو ایک ہفتے سے ایک مہینے تک کے عرصے پر محیط ہوتی تھیں) کا سلسلہ شروع ہوا۔ ادھر لاہور میں سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور پھر پاکستان ٹیلی ویژن پر یہ درسِ قرآن شروع ہوا..... اس دعوتِ قرآنی کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ ۱۹۸۴ء (۱۴۰۴ھ) میں نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز ہوا۔''

''اس سلسلے میں دورۂ ترجمہ قرآن کا جو پروگرام ۱۹۹۸ء میں کراچی کی قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں ہوا' اس کی آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ اعلیٰ معیار پر کی گئی تھی۔ چنانچہ یہ بحمداللہ آڈیو ویڈیو کیسٹوں اور سی ڈیز' ڈی وی ڈیز اور ٹی وی چینلز کے ذریعے پوری دنیا میں نہایت وسیع پیمانے پر پھیل چکا ہے —— اور اب اسے کتابی شکل میں بھی شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے' جس کی پہلی جلد آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔''(۳)

۲۶ر نومبر ۲۰۰۸ء کو حصّہ اوّل کی طباعت کے موقع پر ڈاکٹر اسرار احمد نے ''بیان القرآن'' کے دعوتی و تبلیغی سفر کی روداد سنائی تھی' جس کا تذکرہ سطورِ بالا میں کیا گیا۔ آخری حصّہ ہفتم میں ''کلمۂ تشکّر'' کے عنوان سے حافظ خالد محمود خضر (مدیر شعبہ مطبوعات' مرتب ''بیان القرآن'') نے حمد و ثنا کے بعد تحریر کیا ہے:

''اس کٹھن کام جسے خود ڈاکٹر صاحب نے ''پہاڑ ایسا بھاری'' کام قرار دیا تھا' کا آغاز مَیں نے ۲۰۰۶ء میں ''تعارفِ قرآن'' کی ایڈیٹنگ سے کیا تھا' جب کہ ''بیان القرآن'' کا حصّہ اول ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد حصّہ دوم کی ایڈیٹنگ کے دوران مجھے لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین صاحب (ایجوکیشن کور) کی رفاقت میسّر آ گئی' جس کی حیثیت بلاشبہ تائیدِ غیبی کی تھی..... بیان القرآن کے قارئین اس امر سے واقف ہوں گے کہ دعوتِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے ضمن میں یہ تحریری کاوش محض دروسِ قرآن کو لفظ بہ لفظ صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے کتابی صورت میں پیش کر دینے پر منحصر نہیں ہے بلکہ خطابی انداز کو تحریری اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش ہے' جس میں الفاظ اور جملوں کی تقدیم و تاخیر کے علاوہ کہیں حسبِ ضرورت اختصار سے کام لیا جاتا ہے تو کہیں بعض الفاظ یا جملوں کا اضافہ بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ گویا ٹیپ سے اتارے گئے مسودہ کو از سرِ نو تحریر کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ احادیثِ نبوی کے صحتِ متن اور تخریج کا اہتمام بھی کیا گیا ہے.....''(۴)

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید' حصّہ ہفتم کے پیش لفظ میں تحریر کرتے ہیں:

''بیان القرآن'' عام معنوں میں تفسیر قرآن نہیں ہے' جیسا کہ خود انہوں (والد گرامی) نے اپنی ''تقدیم'' میں خود اس حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ انہیں ہرگز ''مفسّر'' ہونے کا دعویٰ نہیں ہے..... والد محترم کی تمام مساعی پر اگر نگاہ ڈالیں تو ع ''میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!'' کے مصداق اُمّت کو دوبارہ قرآن کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کا مظہر ہیں اور اس ضمن میں شیخ الہندؒ (مولانا محمود حسن) نے جو راستہ تجویز کیا' یعنی قرآن حکیم کو لفظاً اور معناً عام کرنا' لوگوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں قرآن کے معانی سے روشناس کرانا اور انہیں قرآن کی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کرنا' اسی کی عملی تعبیر ہیں۔''

اس ضمن میں وہ والد گرامی کے اظہارِ خیال (شامل در تقدیم حصّہ اول) کو نقل کرتے ہیں:

''اس جلد میں ابھی سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ کی ترجمانی ہوئی ہے' گویا کہ ابھی پہاڑ ایسا کام باقی ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے توقع ہے کہ جیسے اُس نے میرے کسی ارادے یا منصوبہ بندی کے بغیر اور میری خالص لاعلمی میں پیش نظر جلد شائع کرادی ہے' ویسے ہی باقی بھی شائع کرادے گا—— خواہ میری اس دنیا سے دارِآخرت کی جانب روانگی کے بعد ہی سہی!''(۵)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی داعیانہ زندگی کا ایک اہم پہلو ان کی پُرجوش اور ولولہ انگیز تقاریر سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ احادیث کریمہ کے حوالے سے عالمی امت اسلامی اور بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کو مستقبل کے خطرات سے باخبر کرتے ہیں۔ بطورِ خاص احادیث میں وارد قربِ قیامت کی علامات کو انہوں نے اپنی درجنوں تقریروں میں بیان کیا ہے۔ ان کی تقریباً تمام تقاریر آج ''یوٹیوب'' پر موجود ہیں' جنہیں مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور نے پورے اہتمام سے اَپ لوڈ کیا ہے۔ موجودہ حالات میں ان سے بھی رہنمائی لینے کی ضرورت ہے۔

تعارفِ قرآن اور عظمتِ قرآن

''بیان القرآن'' میں سورۃ الفاتحہ سے پہلے ''تعارفِ قرآن اور عظمتِ قرآن'' کے عنوانات (۱۶۷ صفحات) ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی قرآنی بصیرت کی گواہی دیتے ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیان القرآن کے لعل وگہر کی جستجو سے قبل ''فاتحہ بیان القرآن'' کے طور پر ان دونوں عنوانات کی سیر کر لی جائے۔

(۱) ''تعارفِ قرآن'' میں آٹھ ابواب (ص ۱۳ تا ۹۸) ہیں' جن میں اہم موضوعات یہ ہیں: قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام' قرآن کا رسول اللہ ﷺ پر نزول' قرآن کی محفوظیت' قرآن کی زبان' قرآن کے اَسماء وصفات' قرآن کا اسلوبِ کلام' قرآن کی ترکیب وتقسیم' تدوینِ قرآن' قرآن کا موضوع' فہمِ قرآن کے اصول' اعجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ' قرآن مجید سے ہمارا تعلق' قرآن حبلُ اللہ ہے' مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق۔

سطور ذیل میں ان ۸۶ صفحات کی چند جھلکیاں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:

(۱) قرآن کے اسلوب کلام پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہمارے ہاں معروف معنی میں کتاب کا اطلاق جس چیز پر کیا جاتا ہے اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔ البتہ یہ ''الکتاب'' ہے بمعنی لکھی ہوئی شے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کتاب قرار دیا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ کثرت سے یہی لفظ ''کتاب'' ہی قرآن میں آیا ہے۔ یہ لفظ ساڑھے تین سو (۳۵۰) جگہ آیا ہے۔ قُرآن اور قُرآنًا تقریباً ۷۰ مقامات پر آیا ہے۔ لیکن ''قرآن'' exclusive آیا ہے' جب کہ کتاب کا لفظ توراۃ' انجیل' علم خداوندی اور تقدیر کے لیے بھی آیا ہے اور قرآن مجید کے حصوں اور احکام کے لیے بھی آیا ہے۔ بہرحال کتاب اس معنی میں تو ہے۔ معاذ اللہ' کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کتاب نہیں ہے' لیکن جس معنی میں ہم لفظ کتاب بولتے ہیں اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔''(حصّہ اوّل' ص: ۳۴)

(۲) ''قرآن مجید مجموعہ مقالات بھی نہیں ہے' بلکہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔ عرب میں دو ہی چیزیں زیادہ معروف تھیں: خطابت یا شاعری۔ خطبے میں مخاطَب اور خطیب کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہوتا ہے۔ مخاطِب کو معلوم ہوتا ہے

کہ میرے سامنے کون لوگ بیٹھے ہیں' ان کی فکر کیا ہے' ان کی سوچ کیا ہے' ان کے عقائد کیا ہیں' ان کے نظریات کیا ہیں۔ وہ ان کا حوالہ دیے بغیر اپنی گفتگو کے اندر اُن پر تنقید بھی کرے گا' ان کی تصحیح بھی کرے گا' لیکن کوئی تمہیدی کلمات نہیں ہوں گے کہ اب میں تمہاری فلاں غلطی کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں' مَیں اب تمہارے اس خیال کی نفی کرنا چاہتا ہوں' بلکہ وہ روانی کے ساتھ آگے چلے گا۔ مخاطِب اور مخاطَب کے مابین ایک ذہنی ہم آہنگی ہوتی ہے' وہ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں' اور خاص طور پر مخاطبین کے فہم' اُن کی سمجھ' اُن کے عقائد' ان کے نظریات سے خطیب واقف ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خطبے کی شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تحویلِ خطاب ہوتی ہے اور بغیر وارننگ کے ہوتی ہے۔ بسا اوقات غائب کو حاضر فرض کر کے اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔'' (ص:۳۵) مزید کہتے ہیں کہ مقالے میں عام طور پر صرف عقل سے اپیل کی جاتی ہے' جب کہ خطبے میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی اپیل ہوتی ہے .....مؤثر خطبے کے شروع میں بہت جامع گفتگو ہوتی ہے۔ کامیاب خطبہ وہی ہے جس کا آغاز ایسا ہو کہ مقرر اور خطیب اپنے مخاطبین اور سامعین کی توجّہ اپنی طرف مبذول کرا لے.....اور پھر اگرچہ خطبے کے دوران مضمون دائیں' بائیں' اِدھر اور اُدھر پھیلے گا لیکن آخر میں آ کر وہ پھر کسی مضمون کے اوپر مرتکز ہو جائے گا۔ اس ضمن میں عوامی خطیب عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا حوالہ پیش کرتے ہیں جو چار چار' پانچ پانچ گھنٹے تقریر کیا کرتے تھے اور مخاطب کو یکسور کھنے میں کامیاب تھے۔ (ص:۳۶)

(۳) قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم کی بابت کہتے ہیں کہ: ''قرآن کلام مرکب ہے۔ اس کی تقسیم سورتوں اور آیات میں ہے۔ پھر اس میں احزاب اور گروپ ہیں۔ قرآن حکیم نے اپنی اصطلاحات خود وضع کی ہیں۔ ان اصطلاحات کی دنیا میں موجود کسی بھی کتاب کی اصطلاحات سے کوئی مشابہت نہیں ہے.....اللہ تعالیٰ کا یہ کلام سورتوں پر مشتمل ہے۔ قرآنی آیات کے آخری الفاظ میں جو صوتی آہنگ ہے اس کے لیے ''ردیف اور قافیہ'' کے بجائے ''فواصل'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے.....قرآن کا سب سے چھوٹا یونٹ ''آیت'' ہے.....انگریزی میں آیت کے لیے ہم verse بول دیتے ہیں مگر verse تو شعر کو کہتے ہیں جب کہ قرآن کی آیات نہ تو شعر ہیں' نہ مصرعے ہیں' نہ جملے ہیں۔ پس بعینہٖ لفظ ''آیت'' ہی کو عام کرنا چاہیے.....جان لینا چاہیے کہ آیات کا تعین کسی گرامر' بیان یا نحو کے اصول پر نہیں ہے۔ اس میں کوئی اجتہاد داخل نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک اصطلاح ''توقیفی'' استعمال ہوتی ہے' یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے.....(ص:۳۷' ۳۸) قرآن کی آیتیں جمع ہوتی ہیں تو سورتیں وجود میں آتی ہیں۔ سورت کا لفظ ''سُور'' سے ماخوذ ہے اور یہ لفظ سورۃ الحدید میں ''فصیل'' کے معنی میں آیا ہے.....آیات کو جب جمع کیا گیا تو اس سے جو فصیلیں وجود میں آئیں وہ سورتیں ہیں۔ فصل علیحدہ کرنے والی شے کو کہتے ہیں۔ تو گویا ایک سورت دوسری سورت سے علیحدہ ہو رہی ہے۔ البتہ یہ سورتیں ابواب نہیں ہیں' بلکہ جس طرح آیت کے لیے لفظ verse مناسب نہیں اسی طرح سورت کے لیے لفظ ''باب'' یا chapter درست نہیں۔ (ص:۳۹)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ قرآن کی سات منازل کی بابت ان الفاظ میں معلومات فراہم کرتے ہیں:

''دورِ صحابہ میں سورتوں کی گروپنگ کو ''احزاب'' کہا گیا جس کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔ یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا تھا کہ ہر شخص اپنے لیے تلاوت کی ایک مقدار معیّن کر لیتا تھا۔ چنانچہ ہر ہفتے اکثر صحابہ پورے قرآن کی تلاوت ختم کر لیتے تھے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کے سات حصّے ایسے ہو جائیں کہ ایک حصّہ روزانہ تلاوت کریں تو ہر ہفتے قرآن مجید کا دورہ مکمل ہو جائے۔ ان گروپوں کے لیے آج کل ہمارے ہاں جو لفظ مستعمل ہے وہ ''منزل'' ہے لیکن احادیث و روایات میں ''حزب'' کا لفظ آتا ہے۔ احزاب/منازل کو بالکل یکساں مساوی تقسیم نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو سورتیں ٹوٹ جاتیں' ان کی فصیلیں ختم ہو جاتیں۔ چنانچہ ہر حزب میں پوری پوری سورتیں جمع کی گئیں۔ اس طرح احزاب یا منزلوں کی مقداریں مختلف ہو گئیں۔ چنانچہ کچھ حزب چھوٹے ہیں' کچھ بڑے ہیں' لیکن ان کے اندر سورتوں کی فصیلیں نہیں ٹوٹیں' یہ ان کا حسن ہے۔''(۶)

رکوع اور پاروں کی تقسیم: سورتوں کی پہلی تقسیم رکوعوں میں ہے۔ یہ تقسیم دورِ صحابہؓ اور دورِ نبویؐ میں نہیں تھی..... یہ تقسیم حجاج بن یوسف کے زمانے میں یعنی تابعین کے دور میں ہوئی ہے۔ یہ تقسیم بڑی محنت سے معانی پر غور کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ کسی مقام پر ایک مضمون مکمل ہو گیا اور دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے تو وہاں اگر رکوع کر لیا جائے تو بات ٹوٹے گی نہیں..... لیکن چند ایک مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت یہاں سے ہٹا کر رکوع ماقبل میں شامل کی گئی ہوتی یا رکوع کا نشان اس آیت سے پہلے ہوتا تو معانی و مفہوم کے اعتبار سے بہتر ہوتا..... اس کے علاوہ ایک اور تقسیم پاروں کی شکل میں ہے۔ یہ تقسیم تو اور بھی بعد کے زمانے کی ہے اور بڑی بھونڈی تقسیم ہے' اس لیے کہ اس میں سورتوں کی فصیلیں توڑ دی گئی ہیں..... اس بھونڈی تقسیم کی مثال دیکھئے کہ سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں ہے جب کہ باقی پوری سورت چودھویں پارے میں ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی نسخوں میں ایسا ہی ہے۔ البتہ اہلِ عرب کے لیے جو قرآن مجید شائع کیا جاتا ہے اس میں رموزِ اوقاف اور علاماتِ ضبط بھی مختلف ہیں اور اس میں چودھواں جزء سورۃ الحجر سے شروع کیا جاتا ہے۔(۷)

ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مُصحف کا اختلاف: متفق علیہ بات یہ ہے کہ ترتیب نزولی بالکل مختلف ہے اور ترتیب مصحف بالکل مختلف۔ اور موجودہ ترتیب مصحف' توقیفی ہے۔ اکثر و بیشتر جو سورتیں ابتداء میں نازل ہوئیں وہ آخر میں درج ہیں۔ اور ہجرت کے بعد جو سورتیں نازل ہوئیں (البقرہ' آل عمران' النساء' المائدہ) ان کو شروع میں رکھا گیا ہے۔ تو اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف مختلف ہے..... ترتیبِ نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کو مرتب کیا جائے تو ایک اعتبار سے وہ سیرت النبیؐ کی کتاب بن جائے گی۔ اس لیے کہ آغازِ وحی کے بعد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال تک وہ زمانہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس پورے زمانہ کے ساتھ قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کا جو مجموعی ربط ہے' ترتیب نزولی کی مدد سے اسے سمجھنے اور غور و فکر کرنے میں مدد ملتی ہے..... ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں جلال الدین سیوطی نے ایک قول نقل کیا ہے کہ اگر سارے انس و جن مل کر کوشش کر لیں تب بھی ترتیبِ نزولی پر قرآن کو مرتّب نہیں کیا جا سکتا..... ایک ایک آیت کے بارے میں معیّن کرنا اور

اس کی ترتیب کے بارے میں اجماع ناممکن ہے.....(ص: ۴۲)

دوسری طرف اس ترتیب مصحف کے اعتبار سے اس دور میں سورتوں کی ایک نئی گروپنگ کی طرف راہنمائی ہوتی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے خاص طور پر اپنی توجّہ کو ''نظمِ قرآن'' پر مرکوز کیا' آیات کا باہمی ربط تلاش کیا۔ نیز یہ کہ آیتوں کی وہ کون سی قدر مشترک ہے جس کی بنا پر ان کو سورتوں میں جمع کیا گیا۔ پھر یہ کہ ہر سورہ کا ایک عمود اور مرکزی مضمون ہے۔ بظاہر آیات غیر مربوط نظر آتی ہیں' لیکن درحقیقت ان کے مابین ایک منطقی ربط موجود ہے اور ہر آیت اس سورہ کے عمود کے ساتھ مربوط ہے۔ مزید یہ کہ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ ان جوڑوں پر مولانا فراہیؒ نے زیادہ توجہ کی اور ان کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس بات کو مزید آگے بڑھایا۔ اس مقام پر ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے مقدّمہ نظام القرآن از حمید الدین فراہی اور تدبّر قرآن از مولانا امین احسن اصلاحی کی بابت بڑی تفصیل کے ساتھ دونوں کے نتیجہ فکر کی وضاحت کی ہے اور بعض جگہوں پر مولانا امین احسن اصلاحی سے اپنے اختلاف کو بھی درج کیا ہے۔ (ص: ۴۳' ۴۴)

<u>فہمِ قرآن کے اصول</u>: ڈاکٹر اسرار احمد نے فہمِ قرآن کے آٹھ اصول بیان کیے ہیں:

(۱) قرآن مجید کا اسلوبِ استدلال فطری ہے اور اس کا انداز خطابی ہے۔ اس کا استدلال منطقی نہیں ہے۔ ایمانی حقائق کو جب استخراجی منطق کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تو یقین کم اور شک زیادہ پیدا ہوا۔ اس ضمن میں کانٹ کی بات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے' لہٰذا علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات کا آغاز کانٹ ہی کے حوالے سے کیا ہے۔ کانٹ نے حتمی طور پر ثابت کر دیا کہ کسی منطقی دلیل سے خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منطق میں اللہ کی ہستی کو ثابت کرنے کے لیے ایک دلیل لائیں گے تو منطق کی دوسری دلیل اسے کاٹ دے گی۔ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق' منطق کو کاٹ دے گی۔ قرآن نے اگرچہ کہیں کہیں منطق کو استعمال تو کیا ہے لیکن وہ منطقی اصطلاحات میں نہیں ہے۔ (ص: ۶۱)

(۲) قرآن حکیم میں محکم اور متشابہ کی تقسیم پر آیات کی روشنی میں گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ دائمی متشابہات عالَمِ غیب اور عالَمِ مثال ہیں۔ اِس زندگی میں اس کی حقیقتوں کو سمجھنا محال ہے..... البتہ متشابہات کا ایک دوسرا دائرہ ہے جو تدریجاً متشابہات سے محکمات کی طرف آ رہا ہے۔ وہ دائرہ مظاہر طبیعی (Physical Phenomena) سے متعلق ہے..... ایک ذرّے (atom) کا مشاہدہ کریں تو اس میں الیکٹرون اور پروٹون حرکت میں ہیں۔ گویا ہر شے حرکت میں ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے یہ بات متشابہات میں تھی' آج وہ محکمات کے دائرے میں آ گئی ہے۔ اس ضمن میں سات آسمانوں کی حقیقت کے مستقبل میں منکشف ہونے کے امکان پر بات کرتے ہیں۔ (ص: ۶۳' ۶۴)

(۳) فہمِ قرآن کے اصول میں تفسیر اور تاویل کا فرق بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد تحقیق کے ساتھ کہتے ہیں کہ لفظ ''تفسیر'' قرآن میں ایک ہی بار جب کہ لفظ ''تاویل'' سترہ (۱۷) بار آیا ہے۔ تفسیر کا معنی ہے کسی شے کا کھولنا'

واضح کر دینا‘ کسی شے کو روشن کر دینا‘ لیکن یہ زیادہ تر مفردات اور الفاظ سے متعلق ہوتی ہے۔ جب کہ تاویل بحیثیت مجموعی کلام کا اصل مدلول ہوتی ہے کہ اس سے مراد کیا ہے‘ اس سے اصل مقصود کیا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا منقول ہے: ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْل)) یعنی ’’اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور تفقّہ عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما۔‘‘ (ص ۶۴)

(۴) تاویل عام اور تاویل خاص کا علم فہم قرآن کے لیے ضروری ہے۔ قرآن حکیم ایک خاص زمانہ ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کے درمیان نازل ہوا۔ چنانچہ اگر اس زمانہ کے لوگوں کے عقائد و نظریات اور ذہنی سطح کو ملحوظ نہ رکھا جاتا تو ان تک ابلاغ ہی ممکن نہیں تھا۔ وہ تو اُمّی (اَن پڑھ) تھے‘ اگر انہیں فلسفہ و سائنسی علوم کے بارے میں بتایا جاتا تو یہ باتیں اُن کے سروں کے اوپر سے گزر جاتیں۔ چوں کہ براہِ راست ابلاغ تھا اس لیے قرآنی آیات ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئیں۔ Time and Space complex میں قرآن حکیم کا ایک مجموعی شانِ نزول ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر غور کریں گے تو یہ تاویل خاص ہو گی..... البتہ قرآن بنی نوع انسان کے لیے ابدی ہدایت کے طور پر نازل ہوا ہے‘ صرف خاص لوگوں اور علاقے کے لیے نازل نہیں ہوا ہے‘ اس اعتبار سے تاویلِ عام کرنا ہو گی..... جس ترتیب سے اس وقت قرآن مجید موجود ہے اصل حجت یہی ہے‘ یہی اصل ترتیب ہے‘ یہی لوحِ محفوظ کی ترتیب ہے..... تاویلِ عام کے لحاظ سے اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہو گا نہ کہ خاص شانِ نزول کا‘ لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ سب سے مناسب بات یہی ہو گی کہ پہلے اس تاویلِ خاص پر غور کریں اور پھر ابدی سرچشمہ ہدایت ہونے کے ناطے اس کے عموم پر غور کریں۔ اس اعتبار سے تاویلِ خاص اور تاویلِ عام کے فرق کو ذہن میں رکھیں۔ (ص ۶۵‘ ۶۶)

(۵) ڈاکٹر صاحب تذکّر و تدبّر کو فہم قرآن کا ایک اصول قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تذکّر کا مطلب تعلّم نہیں ہے۔ تعلّم علم حاصل کرنا یعنی نئی بات جاننا ہے‘ جب کہ تذکّر پہلے سے حاصل شدہ علم جس پر ذہول اور نسیان کے پردے پڑ گئے تھے‘ ان کو ہٹا کر اندر سے اسے برآمد کرنا ہے۔ فطرتِ انسانی کے اندر اللہ کی محبت‘ اللہ کی معرفت کے حقائق مضمر ہیں۔ یہ فطرت میں موجود ہیں صرف ان پر پردے پڑ گئے ہیں‘ دنیا کی محبت غالب آ گئی ہے..... قرآن کا اصل ہدف یہی تذکر ہے۔ سورۃ القمر میں اس تذکّر کی دعوت کو چار بار دہرایا گیا ہے: ﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ۝﴾ ’’ہم نے قرآن کو تذکر کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے‘ تو کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟‘‘..... تذکّر کے لیے حسنِ نیّت‘ طلبِ ہدایت اور عربی زبان کا علم ضروری ہے..... اس کے برعکس تدبر گہرائی میں غوطہ زن ہونے کو کہتے ہیں۔ تدبّر کے اعتبار سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے اور علمِ الٰہی لامتناہی ہے۔ اس کو عبور کرنا ناممکن ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنی تفسیر کا نام ہی ’’تدبّر قرآن‘‘ رکھا ہے اور انہوں نے اس پر بہت محنت کی ہے‘ لیکن تدبّر قرآن کا ایک اور تقاضا بھی ہے جو بدقسمتی سے ان کے سامنے بھی نہیں آیا۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ آج علمِ انسانی جس لیول تک پہنچ گیا ہے‘ میٹیریل سائنسز کے

مختلف علوم کے ضمن میں جو کچھ معلومات انسان کو حاصل ہو چکی ہیں اور وہ خیالات ونظریات جن کو آج مانا جا رہا ہے' ان سے آگاہی حاصل ہو۔ اگر ان کا اجمالی علم نہیں ہے تو اس دَور کے تدبر قرآن کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد آیت قرآنی ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴾ سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرح قرآن کی بھی یہی شان ہے۔ اسی طرح ہدایتِ عملی کے ضمن میں اقتصادیات' سماجیات اور نفسیاتِ انسانی کے سلسلہ میں راہنمائی اور حقائق قرآن میں موجود ہیں' انہیں کیسے سمجھیں گے؟ مثلاً آج کے اقتصادی مسائل کیا ہیں؟ پیپر کرنسی کی حقیقت کیا ہے؟ اقتصادیات کے اصول ومبادی کیا ہیں؟ بینکنگ کی اصل بنیاد کیا ہے؟..... واقعہ یہ ہے کہ آج تدبّر قرآن کسی ایک انسان کے بس کا روگ ہی نہیں رہا' اس کے لیے تو ایک جماعت درکار ہے۔ قرآن پر ''تذکّر وتدبر'' کے لیے ایک یونیورسٹی کی ضرورت پیش کرتے ہیں جس کا مرکزی شعبہ ''تدبّر قرآن'' کا ہو۔ (۸)

(۶) عملی ہدایات اور مظاہر طبیعی کے بارے میں علمی دنیا میں موجود متضاد طرز فکر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن پر غور وفکر کرنے والے کا انداز (attitude) دو اعتبار سے بالکل متضاد ہونا چاہیے۔ سائنسی حوالہ جات جو قرآن میں آئے ہیں ان کی تعبیر کرنے میں آگے سے آگے جایئے' ان میں پیچھے جانے کی ضرورت نہیں' امام رازی اور دیگر قدیم مفسرین کو دیکھنے کی ضرورت نہیں' بلکہ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے بھی کچھ فرمایا ہے تو وہ بھی ہمارے لیے لازم نہیں۔ اس لیے کہ حضور ﷺ سائنس اور ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے! تابیرِ نخل کے واقعہ میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُورِ دُنْيَاكُمْ)) ''اپنے دنیاوی معاملات کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔'' حقیقت یہ ہے کہ مظاہر طبیعی کا معاملہ تو آگے سے آگے جا رہا ہے۔ اس کی تعبیر جدید سے جدید ہونی چاہیے۔ لیکن دین کا جو عملی پہلو ہے اس میں پیچھے سے پیچھے جایئے' یعنی حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل تک پہنچیے۔ جہاں تک دین کے عملی حصے کا تعلق ہے جسے ہم شریعت کہتے ہیں یعنی اوامر ونواہی' حلال وحرام' حدود و تعزیرات وغیرہ' ان تمام معاملات میں ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہوگا ..... ع بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست! (ص: ۷۰ تا ۷۲)

اس بحث کے آخر میں فہمِ قرآن کے لیے جذبہ انقلاب کی ضرورت اور قرآن کے منزّل مِن اللہ ہونے کے ثبوت پر مدلّل گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن دراصل کتابِ انقلاب ہے' اور داخلی وخارجی دونوں طرح کے ثبوتوں کے ذریعہ قرآن کا منزّل من اللہ ہونا اظہر من الشّمس ہے۔ خارجی دلیل کے طور پر مائیکل ہارٹ کا تاریخی جملہ نوٹ کرتے ہیں کہ: ''انسانی تاریخ میں صرف محمد (ﷺ) ہی ایک واحد شخص ہیں جو سیکولر اور مذہبی دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب رہے۔'' داخلی ثبوت کے لیے کہتے ہیں کہ جس پر انسان کا اپنا دل گواہی دے' یعنی انسان کا اپنا باطنی تجربہ بھی قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

باب ہفتم میں اعجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ واسباب پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں' جس کے ذیلی نکات یہ ہیں:

(۱) قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا باہمی تعلق

(۲) محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصل معجزہ: قرآن حکیم

(۳) قرآن کا دعویٰ اور چیلنج

(۴) قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟

(۵) عہدِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا مظہر: علّامہ اقبال

اس آخری ذیلی عنوان میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

''اپنے ایک کتابچے ''علّامہ اقبال اور ہم'' میں، مَیں نے علّامہ اقبال کے لیے چند اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ''اقبال اور قرآن'' کے عنوان سے میں نے علامہ اقبال کو (۱) عظمتِ قرآن کا نشان، (۲) واقفِ مرتبہ ومقامِ قرآن اور (۳) داعی الی القرآن کے خطابات دیے ہیں۔ میں علّامہ اقبال کو اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں۔ قرآن مجید کے علوم ومعارف کی جو تعبیر علّامہ اقبال نے کی ہے اس دور میں کوئی دوسری شخصیت اس کے آس پاس بھی نہیں ہے..... مذکورہ کتابچے میں، مَیں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی گواہی بھی شائع کی ہے، جو کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ مَیں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے، شاید کوئی اور نہ کر سکے، لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں۔ مولانا اصلاحی کا دوسرا تاثر یہ تھا کہ اقبال کو پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا کہ ایسا حُدی خواں اس اُمّت میں پیدا ہوا، لیکن یہ اُمّت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہَما شُما کے کرنے سے کیا ہوگا۔'' (ص ۸۶، ۸۷)

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی عظمت کا جس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ احساس علامہ اقبال کو ہوا ہے، میری معلومات کی حد تک اس درجے قرآن کی عظمت کا انکشاف کسی اور انسان پر نہیں ہوا۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کے متعدد اشعار بھی درج کیے گئے ہیں —— مثلاً:

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لا یزال است و قدیم

باب ہشتم کا عنوان ہے: ''قرآن مجید سے ہمارا تعلق۔'' اس باب میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے گئے ہیں: (۱) ایمان وتعظیم قرآن، (۲) تلاوت وترتیل، (۳) تذکّر وتدبّر، (۴) حکم واقامت اور (۵) تبلیغ وتبیین۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک قرآن مجید کے حقوق کو ادا نہ کرنا قرآن کو ترک کرنے کے مترادف ہے۔ سورۃ الفرقان میں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فریاد نقل ہوئی ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰﴾

''اور پیغمبر کہے گا کہ: اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔''

بیان القرآن کے امتیازات وخصائص

(ا) بیان القرآن کے مصادر و مآخذ

ا: کتب احادیث: قرآنی مطالب ومعانی کی تفسیر کے لیے ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے مستند احادیث سے استشہاد کیا ہے۔ بعد میں احادیث کی ایڈیٹنگ اور مراجع کی نشاندہی کا مشکل فریضہ از آغاز تا انجام حافظ خالد محمود خضر نے انجام دیا ہے۔ حصّہ اول (فاتحہ‘ البقرۃ) میں مسلسل ۴۰ حواشی تخریج احادیث سے متعلق ہیں جب کہ بعد کے حصّوں اور ان کی سورتوں میں یہ تشریحی حواشی ہر صفحہ کے اعتبار سے تیار کیے گئے ہیں۔ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ سنن ابن ماجہ اور سنن نسائی کی احادیث‘ ان کے ابواب اور احادیث کا متن درج کیا گیا ہے۔ بعض مجامیع کے اضافے حسبِ حال ہیں اور ان میں کہیں کہیں احادیث کے نمبر شمار بھی جدید ایڈیشنوں کے اعتبار سے واضح کر دیے گئے ہیں اور مجامیع کی جلدوں کی تعیین بھی نظر آتی ہے (۱ / ۴۱۲)۔ ان میں اس بات کا بھی اہتمام ہے کہ احادیث کے مجموعوں میں اختلاف متن کی بھی نشاندہی ہو جائے (۱ / ۲۴۵)۔ مذکورہ کتب احادیث کے علاوہ جن مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے‘ وہ یہ ہیں: مشکوٰۃ المصابیح‘ جامع ترمذی‘ بیہقی‘ مستدرک حاکم‘ ابن خزیمہ وغیرہ کے علاوہ بعض دیگر کتابیں۔

ب: مترجمین‘ مفسرین اور کتب تفسیر: بیان القرآن کی اس خوبی کا بھی اعتراف کیا جانا چاہیے کہ اس کا پورا ترجمہ کسی دوسرے ترجمہ کا چربہ نہیں ہے۔ فارغ التحصیل نہ ہونے کے باوجود ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے جو ترجمہ پیش کیا ہے وہ معیارِ مطلوب کو پہنچتا ہے۔ وہ اپنے ترجمہ کو ’’رواں ترجمہ‘‘ قرار دیتے ہیں۔ مطالب آیات کے ضمن میں وہ متقدمین سے استفادہ کرتے ہیں۔ مثلاً ابن کثیر‘ جلال الدین سیوطی اور علامہ آلوسی کے علاوہ اردو مفسّرین میں وہ تدبّر قرآن (امین احسن اصلاحی)‘ معارف القرآن (مفتی محمد شفیع)‘ تفہیم القرآن (سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)‘ شاہ عبدالقادر کے موضح القرآن‘ مولانا محمود حسن اور شبیر احمد عثمانی‘ ثناء اللہ پانی پتی‘ دلائل النظام اور ذبیح کون ہے؟ (علامہ حمید الدین فراہی) کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ مذکورہ حوالے کبھی توثیق وتائید کے لیے لاتے ہیں اور کبھی ان سے اختلاف کے پیش نظر۔ مصادر میں متعلقہ کتب پر اگر کوئی ذاتی کتابچہ یا تحقیق تحریر شدہ ہوتی ہے تو اس کی طرف مراجعت کا مشورہ دیتے ہیں یا بلا تکلف سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کی طرف بھی راغب کرتے ہیں۔

ج: فارسی واردو منظوم کلام‘ اور انگریزی مترادفات: ’’بیان القرآن‘‘ کے اکثر سامعین چونکہ عصری جامعات کے فارغین تھے‘ اس لیے تقریب فہم کے لیے ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے عربی‘ فارسی اور اردو کے کلاسیکی ادب کا کم استعمال کیا ہے البتہ سماجیات‘ معاشیات‘ سیاسیات اور نفسیات کی انگریزی اصطلاحات کا جا بجا اور برمحل استعمال کیا ہے۔ اسی طرح اردو کے ساتھ انگریزی کا بکثرت استعمال کرتے ہیں تاکہ سامع پورا مفہوم سمجھ سکے۔ چند الفاظ ملاحظہ کریں:

خیر اعلیٰ کے لیے Summum Bonun‘ ﴿تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ کے لیے ultra violet rays‘ قدر زائد کے لیے surplus value‘ عوامی حاکمیت کے لیے popular sovereignty‘ زمانی ترتیب کے

لیے chronological order، قوانین طبیعی کے لیے physical laws، حیاتیاتی وجود کے لیے organic whole، تحدّی کے لیے challenge، احکام عشرہ کے لیے Ten Commandments، عقدۂ لاینحل کے لیے dilemma، معکوس کے لیے reciprocal، مثنیٰ کے لیے duplicate وغیرہ۔

فارسی واردو منظوم کلام کو اپنے دروس کے درمیان شامل متن کر کے فاضل مدرس نے نہ صرف اردو ادب کو وقار بخشا ہے بلکہ تفسیر قرآن میں اس قدر کا پہلی بار خوبصورت اضافہ کیا ہے۔ سعدی، اقبال، غالب، امیر خسرو، میر تقی میر، ابراہیم ذوق، اکبر الٰہ آبادی، مرزا بیدل اور ظفر علی خان کے فارسی واردو اشعار کے ذریعہ مجلس کو محظوظ کرتے ہیں اور تفسیر کے لیے کلامِ عرب کے جلو میں کلامِ عجم کو وقار بخش دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں:

۞ شیخ سعدیؒ کے فارسی کلام کو ﴿وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝۲۰﴾ (الغاشیة) کی تشریح میں پیش کرتے ہیں:

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقش دفترے است معرفتِ کردگار!

کہ ایک صاحبِ شعور انسان کے لیے سبز درختوں کا ایک ایک پتّا گویا معرفتِ خداوندی کا دفتر ہے۔ شیخ سعدیؒ نے تو اپنے زمانے میں یہ بات اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر کہی تھی لیکن آج سائنسی تحقیق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سبز درختوں کا ایک پتّا دراصل photosynthesis کی فیکٹری ہے۔ یہ فیکٹریاں سارا دن آکسیجن بنانے اور سورج کی روشنی کو جذب کر کے درختوں کی لکڑی کی طرف منتقل کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ (حصّہ ہفتم، ص ۴۶۳)

۞ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرة:۱۵۲) ''پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا'' کے تحت امیر خسرو کا ایک فارسی شعر نقل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس کی محفل تو بہت بلند و بالا ہے، وہ ملاءِ اعلیٰ کی محفل ہے، ملائکہ مقربین کی محفل ہے۔ امیر خسرو معلوم نہیں کس عالم میں یہ شعر کہہ گئے تھے:

خدا خود میرِ محفل بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم!
(حصّہ اوّل، ص ۲۳۶)

۞ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰) ''تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے'' کی تشریح میں علامہ محمد اقبال کا یہ اردو شعر نقل کرتے ہیں:

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!
(حصّہ دوم، ص ۶۸)

۞ علامہ اقبال کا ایک اردو شعر ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران:۱۵۹) ''اور اگر آپؐ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپؐ کے اردگرد سے منتشر ہو جاتے'' کے تحت نقل کرتے ہیں:

کوئی کارواں سے ٹوٹا‘ کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!
(حصّہ دوم‘ ص:۹۶)

۞ ﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ ۝۶﴾ (الانشقاق) ’’اے انسان! تو مشقت پر مشقت برداشت کرتے جارہا ہے اپنے رب کی طرف‘ پھر اس سے ملنے والا ہے‘‘ کے تحت مرزا غالب اور ابراہیم ذوق سے استفادہ کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ مرزا غالب نے اس حوالے سے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

قیدِ حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

ان مشقتوں اور مصیبتوں میں گھری انسانی زندگی کی یہ سختیاں اور پریشانیاں اپنی جگہ‘ لیکن انسان کا اصل مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گھمبیر اور پریشان کن ہے۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟
(حصّہ ہفتم‘ ص:۴۳۹)

د: **مغربی محقّقین اور فلاسفہ کی علمی موشگافیاں:** ڈاکٹر اسرار احمدؒ بقدرِ ضرورت اس استفادے میں مثبت رویوں کو تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً ﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ (البقرۃ:۳) کے تحت لکھتے ہیں کہ اصل حقیقت تو ہمارے حواس کی سرحدوں سے بہت پَرے واقع ہے۔ ہدایتِ قرآنی کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ جو اصل حقیقت ہے وہ اس کی نگاہوں سے مستور ہے۔ انگلستان کے بہت بڑے فلسفی بریڈلے (Bradley) کی کتاب کا عنوان ہے: ’’Appearance and Reality‘‘۔ اُس نے لکھا ہے کہ جو کچھ نظر آرہا ہے یہ حقیقت نہیں ہے‘ حقیقت اس کے پیچھے ہے۔ کنفیوشس (۵۵۱ تا ۴۷۹ ق م) چین کا بہت بڑا حکیم اور فلسفی تھا۔ اس کی تعلیمات میں اخلاقی رنگ بہت نمایاں ہے۔ اس کا ایک جملہ ہے:

There is nothing more real than what can not be seen; and there is nothing more certain than what can not be heard.

یعنی وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جاسکتے اور کانوں سے سنے نہیں جاسکتے ان سے زیادہ یقینی اور واقعی حقائق کوئی اور نہیں۔(۹)

دوسری مثال: ﴿فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۵۰﴾ (القلم) ’’تو اُس کے رب نے اُس کو چن لیا اور اسے پھر صالحین میں سے کردیا‘‘ کی وضاحت میں کہتے ہیں کہ آج پوری دنیا آپ ﷺ کی عظمت کی قائل ہے۔ اس حقیقت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آج ایک عیسائی دانشور مائیکل ہارٹ اپنی کتاب "The 100" میں یہ لکھنے پر مجبور ہے:

“ My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels. ”

’’حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دنیا کی بااثر ترین شخصیات میں سرفہرست رکھنے کے میرے فیصلے پر کچھ قارئین کو حیرت ہوگی اور بعض اس پر سوال بھی اٹھائیں گے‘ لیکن پوری انسانی تاریخ میں صرف اور صرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی واحد شخص ہیں جو مذہبی اور سیکولر دونوں محاذوں پر پوری طرح کامیاب رہے۔‘‘(۱۰)

۹: **عصری حسیت:** فکر اسلامی کے ارتقاء اور اس کی عصری تعبیر وتشریح میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی علمی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ تنظیم اسلامی کی دیگر خدمات کے علاوہ موصوفِ گرامی کے دروسِ قرآن کے اندر حق کے احیاء کی خواہش کا اظہار ہے اور باطل پر سخت تنقیدیں ہیں۔ ان کی تنقیدی دھار اس قدر تیز ہے کہ اس میں انہوں نے لَوْمَةَ لَائِمٍ کی قطعاً پروا نہیں کی ہے۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر سے فیض یاب موصوفِ گرامی نے ’’اقامتِ دین‘‘ کے ہدف کو زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے سامنے رکھا‘ لیکن جماعت اسلامی سے علیحدگی کے اسباب کو بھی واضح لفظوں میں بیان کیا۔ برصغیر میں دیگر دینی جماعتوں کے دعوتی کاموں پر عدمِ اطمینان کا اظہار کیا‘ خانقاہی نظام پر سخت ضربیں لگائیں‘ اور برصغیر میں اسلام کے زوال کا پوسٹ مارٹم کیا۔ انہوں نے قادیانیوں‘ اہل بدعت اور دیگر گمراہ فرقوں کے افکار پر بے باکی کے ساتھ تبصرے کیے۔ ’’بیان القرآن‘‘ میں متعلقہ آیات کی تشریح میں ان کی عصری حسیت انہیں فکرِ اسلامی کا معتبر شارح قرار دیتی ہے! چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۞ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کو اس سورت کا نقطہ عروج یا ذروۂ سنام (climax) قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’اس آیت کا مضمون خصوصی طور پر آج کے مسلمانوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ آج ہمارے ہاں دین کا اصل تصوّر مسخ ہو چکا ہے اور یہ آیت دین کے درست تصوّر کو اجاگر کرتی ہے۔ دراصل انگریزوں کی غلامی کے دور میں ہم مسلمانوں کے ذہنوں میں دین کا عام تصوّر یہی تھا کہ حکومت انگریز کی ہے تو ہوتی رہے‘ ہمیں کیا! ہم نے تو نمازیں پڑھنی ہیں اور روزے رکھنے ہیں۔ اُس دور میں برصغیر کے ایک بہت بڑے عالم نے کہا تھا کہ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے انگریزوں کو ہماری طرف سے کوئی تشویق لاحق ہو‘ اس لیے کہ انہوں نے ہمیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ یعنی انگریز ہمیں نمازیں پڑھنے‘ روزے رکھنے‘ حج ادا کرنے اور داڑھیاں رکھنے سے نہیں روکتا۔ مذہبی آزادی کی اسی وکالت پر علّامہ اقبال نے یہ پھبتی چست کی تھی:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!‘‘

۞ ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ ’’تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں‘‘ کے تحت رقم طراز ہیں:

’’یہ ہے اس کتاب یعنی قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد۔ اب اس کے مقابلے میں اپنی موجودہ صورت کا

بھی جائزہ لیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے قرآن کو کس حد تک ''بے دخل'' کر چکے ہیں۔ کیا قرآن اس لیے نازل ہوا تھا کہ قرآن خوانی کی مجالس سجالی جائیں؟ یا حسنِ قراءت کی محافل کا اہتمام کرلیا جائے' یا اس کی آیات کی خطّاطی کی نمائش لگائی جائیں' یا چالیس من وزنی قرآن سونے کے تاروں سے لکھ کر لوگوں کی زیارت کے لیے رکھ دیا جائے —— اور زندگی باطل نظام کے تحت ہی بسر کی جائے؟ اس حوالے سے مولانا ماہر القادری کی زبان سے قرآن کا یہ شکوہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے:

یہ میری عقیدت کے دعوے' قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں' ایسے بھی ستایا جاتا ہوں!'' (۱۱)

۞ ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے' اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں'' کے تحت تحریر کرتے ہیں:

''نوٹ کیجیے! نہ کوئی لگی لپٹی بات کی گئی ہے اور نہ ہی معذرت خواہانہ اسلوب اپنایا گیا ہے..... میرے نزدیک یہ ''عریاں ترین'' انقلابی عبارت ہے۔ ظاہر ہے جب انقلاب اپنا راستہ بنائے گا اور ظالمانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا مرحلہ آئے گا تو خون بھی ضرور بہے گا اور کچھ سر بھی کچلنے پڑیں گے۔ یہ انقلاب کا ناگزیر مرحلہ ہے..... آیت زیر مطالعہ میں لوہے کا ذکر بھی اسی حوالہ سے آیا ہے کہ اہل حق حالات و زمانہ کی ضرورت کے مطابق اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے سامانِ حرب تیّار کریں' رائج الوقت ٹیکنالوجی سے استفادہ کریں اور باطل کے مقابلے کے لیے مطلوبہ طاقت فراہم کریں۔ لیکن اس انقلابی عمل میں سب سے اہم سوال افرادی قوت کی فراہمی کا ہے اور اس عمل کی ابتدا دعوت و تبلیغ سے ہوگی۔'' (۱۲)

۞ سورۃ الحدید کی آیت ۲۶ و مابعد کو نقطہ عروج (آیت ۲۵) کا ضمیمہ اور تکملہ قرار دیتے ہیں اور آیت ۲۷ میں مذکور ''رہبانیت'' کا بھرپور تعاقب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے ہاں نہ صرف خانقاہی نظام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لیے ''رہبانیت'' اعلیٰ ترین ذریعہ اور وسیلہ قرار پائی..... ''اس کے بعد اسلام میں جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور احیائے خلافت کی چند کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں تو مسلمانوں کے ہاں بھی رہبانیت کے طور طریقے رائج ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی عملی صورت یہ سامنے آئی کہ مخلص اہلِ ایمان اور اہل علم لوگ بادشاہوں اور سلاطین کے رویے کی وجہ سے امت کے اجتماعی معاملات سے لاتعلق ہو کر گوشہ تنہائی میں جا بیٹھے۔ البتہ ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے ان سے اکتسابِ فیض کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ اہل اللہ اور اہلِ علم کی مسندوں نے خانقاہوں کی شکل اختیار کر لی۔ سلاطین و امراء نے اپنے مفاد کے لیے ان خانقاہوں کی سرپرستی کرنی شروع کر دی اور ان کے لیے بڑی بڑی جاگیریں مختص کر دی گئیں' تاکہ خانقاہ اور اس سے متعلقہ لوگوں کے اخراجات احسن طریقے سے پورے ہوتے رہیں اور یہ لوگ حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ چلّہ کشیوں اور اپنی روحانی منازل طے کرنے میں مصروف و مشغول رہیں۔

دوسری طرف ان خانقاہوں سے متعلقہ لوگوں کے ہاں بھی رفتہ رفتہ دین و دنیا کا یہ تصوّر جڑ پکڑتا گیا کہ حکومت کرنا اور اجتماعی معاملات نپٹانا سلاطین و اُمراء کا کام ہے' ہمیں ان معاملات سے کیا سروکار! ہمارا کام تو دینی تعلیمات کی اشاعت اور لوگوں کی اصلاح کرنا ہے' تاکہ وہ اچھے مسلمان اور اللہ کے مقرب بندے بن سکیں۔''(۱۳)

۞ ''سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۱ میں پہلے تلاوتِ آیات' پھر تزکیہ اور پھر تعلیم کتاب وحکمت کا ذکر آیا ہے۔ نکتہ یہ پیدا کرتے ہیں کہ تعلیم کتاب وحکمت سے تزکیہ مقدم ہے۔ اگر نیت صحیح نہیں ہے تو تعلیم کتاب وحکمت مفید نہیں ہوگی' بلکہ گمراہی میں اضافہ ہوگا۔ نیت کج ہے تو گمراہی بڑھتی چلی جائے گی۔ تزکیہ کا حاصل اخلاص ہے' یعنی نیت درست ہوجائے۔ اگر یہ نہیں ہے تو کوئی جتنا بڑا عالم ہوگا وہ اتنا بڑا شیطان بھی بن سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑے بڑے فتنے عالموں ہی نے اُٹھائے ہیں۔ ''دین اکبری'' یا ''دین الٰہی'' کی تدوین کا خیال تو اکبر کے باپ دادا کو بھی نہیں آسکتا تھا' یہ تو ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء تھے جنہوں نے اسے یہ پٹی پڑھائی۔ اسی طرح غلام احمد قادیانی کو بھی الٹی پٹیاں پڑھانے والا حکیم نورالدین تھا' جو ایک بہت بڑا عالم تھا۔''(۱۴)

مذہبی و دینی معاملات میں مسلمانوں کی سہل انگاری پر اس طرح چوٹ کستے ہیں:

''ہم تو رمضان کے قیام اللیل کے لیے بھی اس مسجد کا انتخاب کرتے ہیں جہاں کے قاری صاحب کم سے کم وقت میں ''منزل'' طے کر لیتے ہوں' بلکہ آج کل تو باقاعدہ اشتہارات کے ذریعہ مختلف مساجد میں ایک سے بڑھ کر ایک ''پُرکشش پیکج'' پیش کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں صرف اتنے دنوں میں قرآن ختم کروادیا جاتا ہے..... ہماری مسجد میں نماز تراویح صرف تیس منٹ میں پڑھادی جاتی ہے' وغیرہ غیرہ۔''(۷/ ۳۴۸)

قومِ نوحؑ کی بُت پرستی کا ذکر کرتے ہوئے اپنا دردیوں ظاہر کرتے ہیں:

''..... چنانچہ بعد کی نسلوں کے لوگوں نے عقیدت و احترام کے جذبے کے تحت ان اولیاء اللہ کی مورتیاں بنالیں۔ شروع شروع میں وہ ان مورتیوں کو احتراماً سلام کرتے ہوں گے' لیکن بعد میں رفتہ رفتہ ان کی باقاعدہ پوجا شروع کردی گئی۔ اسی طرح آج ہمارے ہاں بھی بعض لوگ اپنے گھروں میں اولیاء اللہ اور پیروں کی تصاویر بڑے اہتمام کے ساتھ آویزاں کرتے ہیں' بلکہ ان تصویروں کے گلوں میں باقاعدہ ہار بھی ڈالے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک صاحب کے گھر میں ایک تصویر آویزاں دیکھی جس میں خواجہ معین الدین اجمیری' حضرت بختیار کاکی اور بابا فرید گنج شکر رحمہم اللہ تینوں بیک وقت جمع تھے اور تصویر پر ہار ڈالے گئے تھے۔''(۱۵)

اسلام کے نظام عدل وقسط کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کمیونزم اپنے تمام تر دعووں اور انقلابی نعروں کے باوجود ایسی ''معاشی مساوات'' کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی دنیا کو نہیں دکھا سکا۔ اس کے برعکس اسلام کا نظامِ معیشت معاشرے سے معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے اور امیر و غریب کے درمیان فرق کو کم کرنے پر زور دیتا ہے..... آج معاشی پیچیدگیوں کی وجہ سے جدید معاشرے میں جو گمبھیر صورت حال جنم لے رہی ہے اس کا ادراک سب سے پہلے جس عالم دین کو ہوا وہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ شاہ ولی اللہ ایسی صورت حال کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

جس ملک یا معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غیر منصفانہ ہوگا وہاں کچھ لوگ دولت کے انبار جمع کر کے مسرفانہ عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں مبتلا ہو جائیں گے‘ جب کہ محروم طبقے کے لوگ باربرداری کے جانور بن کر رہ جائیں گے۔ (۱۶)

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱: ﴿قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱﴾ ’’وہ کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں‘‘ کے تحت بیان کرتے ہیں:

’’ہم تو صلح والے لوگ ہیں۔ ہماری نظر میں یہ لڑنا بھڑنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ٹکراؤ اور تصادم کوئی اچھے کام تھوڑے ہی ہیں۔ بس لوگوں کو ٹھنڈے ٹھنڈے دعوت دیتے رہو‘ جو چاہے قبول کر لے اور جو چاہے رد کر دے۔ یہ خوامخواہ دشمن سے ٹکرانا اور جنگ کرنا کس لیے؟ اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے قربانیاں دینے‘ مصیبتیں جھیلنے اور مشقتیں برداشت کرنے کے مطالبے کا ہے کے لیے؟‘‘(۱۷)

چند تحقیقاتی مباحث

(۱) ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید:۳) کہتے ہیں کہ صوفیاء نے ’’وحدت الوجود‘‘ کا فلسفہ اس آیت سے اَخذ کیا ہے‘ جو فلسفے کا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ ’’وحدت الوجود‘‘ کی تعبیر میں کچھ لوگوں نے ’’ہمہ اوست‘‘ کا تصوّر گھڑا ہے جس کے کفر و شرک ہونے میں کسی اہلِ علم کو اختلاف نہیں ہے۔ اس آیت کا آسان مفہوم یہ ہے کہ یہ کائنات ’’حادث‘‘ ہے۔ ایک وقت تھا جب یہ موجود نہیں تھی‘ ظاہر ہے اللہ اُس وقت بھی موجود تھا۔ تو اس کائنات کا آغاز اللہ تعالیٰ سے ہوا۔ پھر ایک وقت آئے گا جب اس کائنات میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝۲۶﴾ (الرحمٰن) جب یہ کائنات نہیں رہے گی تو اس وقت صرف اللہ موجود رہے گا ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝۲۷﴾ (الرحمٰن) تو پھر ’’آخر‘‘ کون ہوا؟ ظاہر ہے کہ اللہ۔ اب یوں سمجھیں کہ اول اور آخر کے مابین ظاہر بھی وہ ہے اور باطن بھی وہ ہے۔ (۱۸)

(۲) موصوفِ گرامی نے کئی مقامات پر اسلامی تصوّف کی وکالت کی ہے اور تصوّف و فلسفہ کی روح کو قرآنی آیات میں تلاش کیا ہے۔ سورۃ اللیل کے آخر میں لکھتے ہیں کہ متقدمین میں سے تصوّف کا ذوق رکھنے والے اکثر مفسّرین نے ان سورتوں (الشّمس‘ اللیل‘ الضحیٰ‘ الانشراح) میں بعض باطنی حقائق کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ظاہر ہے موجودہ دور کے عقلیت پسند مفسرین نہ تو تصوّف کا ذوق رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں ایسے موضوعات سے دلچسپی ہے۔ (اِلّا ماشاء اللہ) (۱۹)

(۳) ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝۱۹﴾ (الانشقاق) ’’(اسی طرح) تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ‘‘ کی بابت ارشاد فرماتے ہیں: ’’اسلام کے پہلے غلبے کا ظہور صادق و مصدوق ﷺ کی زندگی میں صبح کے اجالے کی طرح ہوا تھا: ﴿وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۝۳۴﴾ (المدثر) اس اجالے کی شان یہ تھی کہ ادھر آفتابِ نبوت طلوع ہوا اور اُدھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا ماحول منور ہو گیا۔ یعنی حضور ﷺ کی دعوت کے آغاز کے بعد صرف ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا ہو گیا۔ البتہ اسلام کے دوسرے غلبہ کی روشنی چاند کی روشنی کی طرح مرحلہ وار اور تدریجاً پھیلے گی۔ یعنی اب اقامتِ دین اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام کسی ایک داعی یا کسی ایک تحریک کی

کوششوں اور کسی ایک نسل کے زمانے میں نہیں بلکہ نسل در نسل جدّ و جُہد سے قائم ہوگا۔ جیسے برصغیر میں علامہ اقبال نے ایک فکر کو واضح کیا' پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے ''حزب اللہ'' اور مولانا مودودی نے ''جماعت اسلامی'' کے پلیٹ فارم سے اقامتِ دین کے لیے جدّ و جُہد کی۔ اسی طرح آئندہ ادوار میں بھی اللہ کی توفیق سے اُس کے بندے اس جدّ و جُہد کا علم سنبھالے رہیں گے۔''(۲۰)

(۴) ﴿وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ﴾ (الجمعۃ: ۳) ''اور ان ہی میں سے ان دوسرے لوگوں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔'' ڈاکٹر اسرار صاحب فرماتے ہیں: ''حضور ﷺ نے جب ''اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ'' کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ ''یہ اور اس کی قوم کے لوگ۔'' مزید فرمایا کہ دین اگر ثریا پر بھی ہوگا تو اس کی قوم کا ایک شخص اس تک پہنچ جائے گا۔ اس بارے میں تمام حنفی علماء متفق ہیں کہ اس حدیث کے مصداق حضرت امام ابوحنیفہؒ ہیں جو ایرانی النسل ہیں ..... اس ضمن میں میری تحقیق یہ ہے کہ حضرت سام کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے چن لیا تھا' جبکہ حضرت حام کی نسل کو حکمت میں برگزیدہ کیا تھا۔ میں نے آیت زیر مطالعہ کو ایٹم (atom) اور اس کے مرکزہ (nucleus) کے گرد مختلف دائروں میں گھومنے والے الیکٹرانز کی مثال سے سمجھا ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کا مرکزہ (نیوکلیس) ''اُمّیّین'' پر مشتمل ہے' یعنی بنو اسماعیل اور حضور ﷺ کے زمانے کے تمام اہلِ عرب جو اُس وقت آپ ﷺ کے براہِ راست مخاطب تھے۔ اس کے بعد نیوکلیس کے گرد پہلا دائرہ ایرانیوں کے الیکٹرانز سے بنا۔ پھر رومی' قبطی' سندھی' ہندی وغیرہ اقوام کے الیکٹرانز کے دائرے بنے اور پھیلتے گئے ..... لیکن اُمّیّین کے علاوہ باقی کا شمار آخرین میں ہوگا۔''(۲۱)

(۵) ﴿وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز﴾ (البقرہ: ۸۷) ''اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے'' کے ذیل میں نبی اور رسول کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''قرآن مجید کی اصطلاحات کے تین جوڑے ایسے ہیں کہ وہ تینوں مترادف کے طور پر بھی استعمال ہو جاتے ہیں اور اپنا علیحدہ علیحدہ مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ ان کے ضمن میں علماء کرام نے یہ اصول وضع کیا ہے: اِذَا اجْتَمَعا تَفرّقا وَاِذَا تَفَرَّقا اِجْتَمَعَا یعنی جب (ایک جوڑے کے) دونوں لفظ اکٹھے استعمال ہوں گے تو دونوں کا مفہوم مختلف ہوگا' اور جب یہ دونوں الگ الگ استعمال ہوں گے تو ایک معنی میں استعمال ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک جوڑا ''اسلام'' اور ''ایمان'' یا ''مسلم'' اور ''مومن'' کا ہے..... اسی طرح ''جہاد'' اور ''قتال'' کا معاملہ ہے۔ یہ دو مختلف الفاظ ہیں' جن کا مفہوم جدا بھی ہے لیکن ایک دوسرے کی جگہ بھی آجاتے ہیں..... اس ضمن میں تیسرا جوڑا ''نبی'' اور ''رسول'' کا ہے۔ یہ دونوں لفظ اکثر ایک دوسرے کی جگہ آجاتے ہیں' لیکن ان میں فرق بھی ہے۔ ہر نبی رسول نہیں ہوتا' البتہ ہر رسول لازماً نبی ہوتا ہے۔ یعنی نبی عام ہے' رسول خاص ہے۔ نبی کو جب کسی خاص قوم کی طرف معیّن طور پر بھیج دیا جاتا ہے تب اُس کی حیثیت رسول کی ہو جاتی ہے ..... ولی اور نبی میں فرق یہی ہے کہ نبی پر وحی آتی ہے' ولی پر وحی نہیں آتی..... نبی اور رسول کے فرق کے ضمن میں ایک بات یہ نوٹ کر لیجیے کہ نبیوں کو قتل بھی کیا گیا ہے جب کہ رسول قتل نہیں ہو سکتے..... حضرت یحییٰ علیہ السلام نبی تھے' قتل کر

دیے گئے' جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے' لہٰذا قتل نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ان کو زندہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا' جو قیامت سے قبل دوبارہ زمین پر نزول فرمائیں گے۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کے راستے میں شہید ہونے کی شدید تمنّا تھی .....لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خواہش پوری نہیں کی' اس لیے کہ آپؐ اللہ کے رسول تھے۔'' (۱/۱۹۱' ۱۹۲)

(۶) ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ (البقرۃ:۳۵) ''اور ہم نے کہا: اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنّت میں'' کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ وہ جنّت الفردوس نہیں تھی جس میں داخلے کے بعد نکلنے کا کوئی سوال نہیں۔ پھر اپنے اس رجحان کا اظہار کرتے ہیں کہ تخلیق آدم اسی زمین پر ہوئی ہے۔ بائیولوجی اور وحی دونوں اس پر متفق ہیں کہ قشرِ ارض (Crust of the Earth) یعنی مٹی سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس کے بعد کسی اونچے مقام پر کسی سرسبز و شاداب علاقے میں حضرت آدمؑ کو رکھا گیا۔ یعنی ''ہبوط'' کو کسی اونچے مقام سے اترنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ (۱/۱۵۱)

الغرض سات جلدوں میں مختلف نوعیتوں کی تحقیقات کا ''دائرۃ المعارف'' تیار کر دیا گیا ہے۔ البتہ موصوف گرامی کی بعض آراء سے اختلاف کی پوری گنجائش موجود ہے۔ انہیں اپنی آراء پر اصرار بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ''واللہ اعلم بالصواب'' جیسے الفاظ استعمال کرتے جاتے ہیں اور علمی غرور کے بجائے بشری فروتنی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

نظمِ کلام' ربطِ آیات وسُور اور زوج کی بحث

گزشتہ صفحات میں منازل' رکوعوں اور پاروں کی تقسیم کے ضمن میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن ایک مربوط کلام ہے' جس میں سورتیں جوڑوں کی شکل میں گندھی ہوئی ہیں۔ ربطِ کلام کے ذیل میں ڈاکٹر اسرار احمد نے تقریباً ہر سورت کے آغاز میں ''تمہیدی کلمات'' کے اندر سورت زیر بحث کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ نیز بیچ بیچ میں جہاں ضرورت مقتضی ہوئی' ربط و نظم آیات و سور پر قیمتی اضافے کیے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیں:

وہ لکھتے ہیں: ''(مکّی و مدنی گروپس میں) پہلے گروپ کی پہلی سورت سورۃ الفاتحہ ہے جو مکی ہے' اس کے بعد چار مدنی سورتیں ہیں۔ یہ طویل ترین مدنی سورتیں ہیں اور دو دو سورتوں کے دو جوڑوں پر مشتمل ہیں۔ قرآن حکیم کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں' جب کہ کچھ سورتیں منفرد بھی ہیں۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ منفرد ہے' اس کا کوئی جوڑا نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی معنوی مناسبت قرآن مجید کی آخری سورت سورۃ الناس کے ساتھ جڑتی ہے' لیکن بہرحال اُس کا جوڑا سورۃ الفلق ہے۔ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝﴾ دو سورتوں پر مشتمل ایک جوڑا ہے' لہٰذا سورۃ الفاتحہ کا کوئی جوڑا نہیں ہے' یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پورا قرآن ہی اس کا جوڑا ہے۔''(۲۲)

ڈاکٹر اسرار احمد' سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کو ایک جوڑا جب کہ سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ کو دوسرا جوڑا قرار دیتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کے آغاز میں حروفِ مقطّعات (الٓمّٓ) کو اس کی ظاہری علامت قرار دیتے ہیں۔ دوسری دلیل البقرۃ اور آل عمران کے جوڑا ہونے کی یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

دونوں کو ''الزَّھراوین'' کا نام عطا فرمایا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے تمام گروپس کی دیگر مناسبتوں کے علاوہ مضامین کی مناسبت' آغاز وانتہا اور مرکزِ سورہ کی تفصیل سے بھی جابجا استدلال کیا ہے۔ان کی یہ عبارت دیکھیں:

''پہلے گروپ کی مدنی سورتوں میں دو مضمون متوازی چلتے ہیں۔ پہلا مضمون شریعت اسلامی کا ہے..... سورۃ البقرۃ میں یوں سمجھئے کہ احکامِ شریعت کی ابتدا ہوتی ہے ..... پھر سورۃ النساء میں اس کے اندر مزید اضافہ ہوتا ہے' اور سورۃ المائدہ میں شریعت کے تکمیلی احکام آتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ المائدہ تکمیل شریعت کی سورت ہے۔اسی میں وہ آیت ہے: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)۔ گویا شریعت کا ابتدائی خاکہ (بلیو پرنٹ) سورۃ البقرہ میں ہے' البتہ شریعت کی تکمیل سورۃ المائدۃ میں ہے۔''(۲۳)

سورتوں کے مکّی ومدنی گروپس کے بارے میں مزید کہتے ہیں: ''..... یہاں ضمنی طور پر مکّی ومدنی سورتوں کے اس آخری گروپ اور پہلے گروپ کے درمیان مدنی اور مکی قرآن کی مقدار کے حوالے سے پائی جانے والی ایک ''معکوس'' (reciprocal) نسبت کے بارے میں بھی جان لیجیے۔یعنی جس طرح سورتوں کے پہلے گروپ میں مکی قرآن بہت تھوڑا (صرف سورۃ الفاتحہ) اور مدنی قرآن کی مقدار نسبتاً بہت زیادہ (البقرہ' آل عمران' النساء' المائدہ پر مشتمل تقریباً سوا چھ پارے) ہے' اسی طرح آخری گروپ میں مدنی قرآن کی مقدار بہت کم (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) ہے اور اس کے مقابلہ میں مکّی قرآن تقریباً دو پاروں پر مشتمل ہے۔''(۲۴)

سورۃ الناس کے تمہیدی کلمات میں سورۃ الفاتحہ سے مناسبت ان الفاظ میں تلاش کرتے ہیں:

''.....اس سورت کا سورۃ الفاتحہ کے ساتھ بھی جوڑے کا تعلق ہے۔ان دونوں سورتوں کی آیات میں گہری مشابہت اور مناسبت پائی جاتی ہے۔دونوں سورتوں کا ایک ساتھ مطالعہ کرنے سے یہ مشابہت اور مناسبت صاف نظر آتی ہے۔مثلاً سورۃ الفاتحہ کی پہلی اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی حمد وصفات کا بیان اور اُس کے ربّ العالمین ہونے کا اقرار ہے' جب کہ سورۃ الناس کی پہلی آیت میں تمام انسانوں کے رب سے پناہ طلب کی گئی ہے۔دونوں سورتوں کی اگلی دونوں آیات ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ اور ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ کی لفظی ومعنوی مشابہت بہت ہی واضح ہے۔اس کے بعد سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے اور اس کی عبادت کرنے کے عہد کے ساتھ اس سے ہدایت کی درخواست کی گئی ہے' جب کہ اس کے متوازی سورۃ الناس میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت ﴿اِلٰهِ النَّاسِ﴾ کے اقرار کے ساتھ شیطان کے وساوس کے خلاف اس کی پناہ طلب کی گئی ہے..... اس زاویے سے ان دونوں سورتوں کا جائزہ لیا جائے تو سورۃ الناس' سورۃ الفاتحہ کا عکس یا مثنّی (duplicate) بنتی نظر آتی ہے۔''(۲۵)

سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۶۴ تا ۱۶۷ پر ان کا تبصرہ دیکھیں:

''اب جو آیت آرہی ہے اس کے مطالعہ سے پہلے ایک بات سمجھ لیجیے کہ سورۃ البقرۃ کا نصف ثانی جو بائیس

رکوعوں پر مشتمل ہے اور جس کا آغاز انیسویں رکوع سے ہوا ہے' اس میں ترتیب کیا ہے۔ سورۃ البقرہ کے پہلے اٹھارہ رکوعوں کی تقسیم عمودی (vertical) ہے۔ یعنی چار رکوعِ اِدھر' دس درمیان میں' پھر چار اُدھر۔ لیکن انیسویں رکوع سے اب افقی (horizontal) تقسیم کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس حصے میں چار مضامین تانے بانے کی طرح بُنے ہوئے ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ چار لڑیاں ہیں جن کو بٹ کر رسّی بنا دیا گیا ہے۔ ان چار میں سے دو لڑیاں تو شریعت کی ہیں' جن میں سے ایک عبادات کی اور دوسری احکام و شرائع کی ہے کہ یہ واجب ہے' یہ کرنا ہے' یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ نماز فرض ہے' روزہ فرض ہے' وغیرہ وغیرہ۔ احکام و شرائع میں خاص طور پر شوہر اور بیوی کے تعلق کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے' اس لیے کہ معاشرتِ انسانی کی بنیاد یہی ہے۔ لہٰذا اس سورت میں آپ دیکھیں گے کہ عائلی قوانین کے ضمن میں تفصیلی احکام آئیں گے۔ جبکہ دوسری دو لڑیاں جہاد بالمال اور جہاد بالنّفس کی ہیں۔ جہاد بالنّفس کی آخری انتہا قتال ہے' جہاں انسان نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں حاضر ہو جاتا ہے۔''(۲۶)

اس بحث کے ذریعہ جہاں ایک طرف ڈاکٹر موصوف کی وسعت علمی اور ژرف نگاہی کا علم ہوتا ہے' وہیں موضوعاتِ قرآنی پر ان کی گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ قدیم اقوام و ملل کی داستان کو ملّتِ محمدیہؐ پر نہایت خوبصورت اور اچھوتے انداز میں منطبق کرتے ہیں اور مماثلت کا اعلیٰ کینوس فراہم کرتے ہیں۔ راقم کا خیال ہے کہ نظم قرآن کی ان متنوع اور منتشر بحثوں کو الگ کتابی شکل میں لانا چاہیے' تاکہ اس موضوع پر ان کی بحثوں کا فیضان عام ہو سکے۔

نحوی و صرفی تحلیل اور لغوی تحقیقات

ایک قابل مترجم کی بنیادی صفات میں سے ہے کہ وہ کم از کم عربی و اردو کے محاوروں' تمثیلات اور بلاغت کی تفصیلات سے واقف ہو۔ فاضل مترجم کے ترجمہ قرآن میں صلات کی بحثوں' افعال ثلاثی مجرد و رباعی کی خصوصیات اور ان کے اثرات' عطف و معطوف کی بحث' ضمائر کا اطلاق اور قدیم لغات نیز شعراء عرب سے استفادہ کی شان بھی نظر آتی ہے۔ قصص القرآن' قسموں کی بحثیں' حروفِ مقطعات کی حقیقت' نیز کلامِ عرب کے ذریعہ اعجازِ قرآن کی معرفت انہیں نصیب ہوئی تھی۔ چند مثالوں کے ذریعہ اجمالی وضاحت کی جاتی ہے:

۞ ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ﴾ (البقرۃ:۹) ''وہ دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں' اللہ کو اور اہلِ ایمان کو۔'' کہتے ہیں کہ يُخٰدِعُوْنَ بابِ مفاعلہ سے ہے۔ اس باب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں ایک کشمکش اور کشاکش موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے اس کا ترجمہ کیا: ''وہ دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔''(۱/۱۲۸) ایک دوسری جگہ ﴿وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ﴾ (النساء:۱۴۲) ''حالانکہ وہ انہی کو دھوکا میں ڈالنے والا ہے۔'' خادع ثلاثی مجرد سے اسم فاعل ہے اور یہ نہایت زوردار تاکید کے لیے آتا ہے۔ اس لیے ترجمہ میں تاکیدی الفاظ آئے ہیں۔ (حصّہ دوم' ص ۲۲۱)

۞ ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۶﴾ (البقرۃ) ''سو نافع نہ ہوئی ان کی تجارت ان کے حق میں اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔'' رَبِحَ یَرْبَحُ کے معنی ہیں تجارت وغیرہ میں نفع اٹھانا' جو ایک صحیح اور جائز نفع ہے' جب کہ ''ربو'' مادہ سے ''رَبَا یَرْبُوْ'' کے معنی بھی مال میں اضافہ اور بڑھوتری کے ہیں' لیکن وہ حرام ہے۔ تجارت

کے اندر جو نفع ہو جائے وہ ربح ہے جو جائز نفع ہے اور اپنا مال کسی کو قرض دے کر اس سے سود وصول کرنا ''ربا'' ہے جو حرام ہے۔ (حصّہ اوّل، ص: ۱۳۲)

۞ ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝۱۸﴾ (البقرۃ) ''یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو اب یہ نہیں لوٹیں گے۔'' اَصَمُّ بہرے کو کہتے ہیں، صُمٌّ اس کی جمع ہے، اَبْکَمُ گونگے کو کہا جاتا ہے، بُکْمٌ اس کی جمع ہے۔ اَعْمٰی اندھے کو کہتے ہیں، عُمْیٌ اس کی جمع ہے۔ (حصّہ اول، ص: ۱۳۳)

۞ ﴿عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝۳۲﴾ (القلم) ''اُمید ہے ہمارا رب ہمیں اس سے بہتر عطا کر دے گا، اب ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔'' رَغِبَ جب اِلٰی کے صلے کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی کی طرف رغبت کرنے کے ہوتے ہیں لیکن جب لفظ عَنْ کے صلے کے ساتھ آئے تو بالکل متضاد معنی دیتا ہے۔ چنانچہ رَغِبَ عن کے معنی ہوں گے: رُخ پھیر لینا اور پہلو تہی کرنا، جیسا کہ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۳۰ میں آیا ہے: ﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ﴾ (حصّہ ہفتم، ص: ۳۱۳)

''اِلٰی اور عَلٰی'' کی بحث کو ﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷﴾ (البقرۃ) ''یقیناً وہی تو ہے توبہ کا بہت قبول کرنے والا رحم فرمانے والا'' میں اس طرح واضح کرتے ہیں:

''توبہ کا لفظ دونوں طرف سے آتا ہے۔ بندہ بھی توّاب ہے..... جبکہ توّاب اللہ تعالیٰ بھی ہے..... بس فرق یہ ہے کہ جب 'تَابَ' بندے کے لیے آئے گا تو 'اِلٰی' کے صلہ کے ساتھ آئے گا، جیسے ''اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ'' اور جب اللہ کے لیے آئے گا تو 'عَلٰی' کے صلہ کے ساتھ ''تَابَ عَلٰی'' آئے گا، جیسے آیت زیر مطالعہ میں آیا ''فَتَابَ عَلَيْهِ''۔ اللہ کی شان بہت بلند ہے۔ انسان توبہ کرتا ہے تو اُس کی طرف توبہ کرتا ہے، جب کہ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ بندے پر توبہ کرتا ہے۔ (حصّہ اول، ص: ۱۵۴)

۞ ﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴﴾ (البقرہ) ''اور ہو گیا وہ کافروں میں سے'' یا ''اور تھا وہ کافروں میں سے''۔ كَانَ عربی زبان میں دو طرح کا ہوتا ہے ''تامہ'' اور ''ناقصہ''۔ كَانَ ناقصہ کے اعتبار سے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اپنے اس استکبار اور انکار کی وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ جب کہ كَانَ تامہ کے اعتبار سے یہ معنی ہوں گے کہ وہ تھا ہی کافروں میں سے۔ یعنی اُس کے اندر سرکشی چھپی ہوئی تھی، اب ظاہر ہو گئی۔ ایسا معاملہ کبھی ہمارے مشاہدے میں بھی آتا ہے کہ کسی شخص کی بدنیتی پر نیکی اور زُہد کے پردے پڑے رہتے ہیں اور کسی خاص وقت میں آ کر وہ ننگا ہو جاتا ہے اور اس کی باطنی حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ (حصّہ اول، ص: ۱۵۱)

۞ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۲۱﴾ (البقرۃ) ''اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس رب (مالک) کی جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے جتنے لوگ گزرے ہیں (انہیں بھی پیدا کیا) تا کہ تم بچ سکو۔'' کہتے ہیں: ''تمام رسولوں کی دعوت یہی 'عبادتِ رب' ہے اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت بھی یہی ہے، لیکن یہاں ایک بہت بڑا فرق واقع ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ باقی تمام رسولوں کی

دعوت کے ضمن میں صیغہ خطاب ''یٰقَوْمِ'' ہے یعنی ''اے میری قوم کے لوگو!'' جب کہ یہاں صیغہ خطاب ہے: ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ'' یعنی ''اے بنی نوع انسان!'' معلوم ہوا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے پہلے تمام رسول علیہم السلام صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف آئے جب کہ پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری اور کامل رسول ہیں' جن کی دعوت آفاقی ہے۔ (حصّہ اول' ص:۱۳۶)

سائنسی و فقہی مباحث

میڈیکل سائنس سے مناسبت اور سائنسی علوم میں گہری معلومات کا اثر ''بیان القرآن'' کے مطالعہ سے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ نیز موصوف گرامی کو اللہ تعالیٰ نے فقہی بصیرت سے بھی سرفراز فرمایا۔ سائنسی مباحث اور فقہی مسائل کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

۞ ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ﴾ (الدھر:۲) ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے ملے جلے نطفے سے۔'' اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں: ''موجودہ دور میں سائنس نے اس آیت کا مفہوم بہت اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ مرد کی طرف سے Spermatozoon اور ماں کی طرف سے ovum ملتے ہیں تو zygote وجود میں آتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے پندرہ سو سال پہلے صحرائے عرب کا ایک بدو لفظ ''اَمْشَاج'' کو اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق ہی سمجھا ہوگا۔ گویا قرآن مجید کے اعجاز کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم ہر زمانے کے ہر قسم کے انسانوں کے لیے قابلِ فہم رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کے معانی و مطالب میں نئی نئی جہتیں بھی دریافت ہوتی رہتی ہیں۔''(۲۷)

۞ ﴿اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾﴾ (النّٰزعٰت) ''اس میں سے نکالا اس کا پانی اور اس کا چارہ۔'' تشریح کرتے ہیں کہ: ''یہاں یہ نکتہ خصوصی طور پر لائقِ توجّہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جتنا پانی موجود ہے اس کا منبع خود زمین ہے۔ آج سائنسی معلومات کی روشنی میں ہم اس کی وضاحت یوں کر سکتے ہیں کہ ابتدا میں زمین آگ کا ایک گولا تھی۔ جوں جوں یہ ٹھنڈی ہوتی گئی' اس کے بخارات نکل کر فضا میں جمع ہوتے رہے۔ اس طرح زمین کے گرد مختلف گیسوں پر مشتمل ایک غلاف سا بن گیا' جسے آج ہم فضا (atmosphere) کہتے ہیں۔ پھر کسی مرحلے پر فضا میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پانی بنا۔ یہ پانی فضا سے بارش کی شکل میں سالہا سال تک زمین پر برستا رہا۔ اس کے بعد سورج کی تپش سے بخارات اٹھنے' بادل بننے اور بارش برسنے کے معمول پر مشتمل پانی کا وہ مربوط نظام بنا جسے آج کی سائنس نے واٹر سائیکل (water cycle) کا نام دیا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقدار کے مطابق دنیا میں پانی پیدا فرما کر زمین پر موجود زندگی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس کی رسد اور ترسیل کا ایک خوبصورت نظام (cycle) تشکیل دے دیا ہے۔ اس نظام کے تحت سمندروں کے بخارات سے بادل بنتے ہیں۔ ان بادلوں سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کے تحت مختلف علاقوں میں بارش برستی ہے اور برف باری ہوتی ہے۔ پھر پہاڑوں پر برف کے وسیع ذخائر سے نالوں اور دریاؤں

کے ذریعے نشیبی علاقوں کو سارا سال پانی کی سپلائی جاری رہتی ہے۔ گویا بارشوں اور پہاڑی گلیشیرز کے overhead tanks سے حاصل ہونے والے پانی سے پوری دنیا میں زیرِ زمین پانی کے ذخیرے کو رسد بھی مہیّا ہوتی رہتی ہے اور ہر طرح کی زندگی کی تمام ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جو پانی بچ رہتا ہے وہ واپس سمندر میں چلا جاتا ہے۔'' (حصّہ ہفتم' ص: ۴۱۲)

۞ سورۃ الفاتحہ کے نماز کا جزو لازم ہونے کی فقہی بحث کے ضمن میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث کا متن پیش کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((لَاصَلَاۃَ لِمَن لَمْ یَقْرَأ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ)) یعنی جو شخص (نماز میں) سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھتا تو اس کی کوئی نماز نہیں ہے۔ حضرات فقہاء کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ امام جب سورۃ الفاتحہ پڑھے گا تو ہم پیچھے بالکل نہیں پڑھیں گے' بلکہ امام کی قراءت ہی مقتدیوں کی قراءت ہے۔ ان کی دلیل نقل کرتے ہیں: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾﴾ (الاعراف) اور حدیث نبوی: ((مَنْ کَانَ لَہُ امامٌ فَقِرَاءَۃُ الامامُ لہ قِرَاءَۃٌ)) پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ چاہے نماز جہری (بآواز بلند قراءت والی) ہو یا سِرّی (خاموش قراءت والی) ہو' امام کے پیچھے مقتدی بھی سورۃ الفاتحہ پڑھیں گے۔ تیسرا ایک درمیانی مسلک بھی ہے اور وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہما کا ہے' جس کی رو سے امام جب جہری نماز میں بالجہر قراءت کر رہا ہو تو مقتدی سورۃ الفاتحہ مت پڑھے' بلکہ امام کی قراءت خاموشی سے سنے' لیکن جو سِرّی نماز ہے اس میں امام اپنے طور پر سورۃ الفاتحہ پڑھے اور مقتدی اپنے طور پر خاموشی سے پڑھے۔ اور میں نے بہرحال اسی کو اختیار کیا ہوا ہے۔ (حصّہ اوّل' ص: ۱۰۴)

۞ ﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۲۷﴾﴾ (البقرۃ) ''اور اگر وہ طلاق کا ارادہ کر چکے ہوں تو اللہ سننے والا' جاننے والا ہے۔'' یعنی چار ماہ گزر جانے پر شوہر کو بہرحال فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یا تو رجوع کرے یا طلاق دے۔ اب عورت کو مزید معلّق نہیں رکھا جا سکتا۔ رجوع کی صورت میں چونکہ قسم توڑنا ہوگی' لہٰذا اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ حکم جاری کیا تھا کہ جو لوگ جہاد کے لیے گھروں سے دُور گئے ہوں انہیں چار ماہ بعد لازمی طور پر گھر بھیجا جائے۔ آپؓ نے یہ حکم غالباً اسی آیت سے استنباط کرتے ہوئے جاری فرمایا تھا۔ اس معاملہ میں آپؓ نے اپنی بیٹی اور زوجہ نبی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ: ایک عورت کتنا عرصہ اپنی عفت و عصمت کو سنبھال کر اپنے شوہر کا انتظار کر سکتی ہے؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: چار ماہ۔ باپ بیٹی کے رشتہ کے باوجود دین کے معاملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شرم و حیا کو آڑے نہ آنے دینا بہت اہم ہے۔ (حصّہ اوّل' ص: ۲۹۵)

۞ ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ﴾ (المائدۃ:۶) ''تو دھولیا کرو اپنے چہرے اور دونوں ہاتھ بھی کہنیوں تک اور اپنے سروں پر مسح کر لیا کرو اور (دھولیا کرو) اپنے دونوں پاؤں بھی ٹخنوں تک۔'' یہاں پر واضح رہے کہ اَرْجُلَکُم اور اَرْجُلِکُم

دونوں قراءتیں مستند ہیں' لہٰذا اہل تشیع اس کو مستقلاً اَرْجُلِکُمْ پڑھتے ہیں اور ان کے نزدیک اس میں پاؤں پر مسح کا حکم ہے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ وہ اس طرح کرتے ہیں: ''اور مسح کرلیا کرو اپنے سروں پر بھی اور اپنے پاؤں پر بھی۔'' لیکن اہل سُنّت کے نزدیک یہ اَرْجُلَکُمْ ہے اور اِلَی الْکَعْبَیْنِ کے اضافے سے یہاں پاؤں کو دھونے کا حکم بالکل واضح ہوگیا ہے۔ اگر مسح کرنا مطلوب ہوتا تو اس میں کوئی حد بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا اِلَی الْکَعْبَیْنِ کی شرط سے یہ ٹکڑا ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ﴾ کے بالکل مساوی ہوگیا ہے۔ جیسے ہاتھوں کا دھونا ہے کہنیوں تک' ایسے ہی پاؤں کا دھونا ہے ٹخنوں تک۔ اس حکم میں وضو کے فرائض بیان ہوئے ہیں۔(۲۸)

خلاصہ مبحث

ڈاکٹر اسرار احمد کی تفسیر ''بیان القرآن'' میں خطابی اسلوب کی جلوہ سامانی ہے اور شاید کلماتِ الٰہی جو خطاب کا طرز و آہنگ رکھتے ہیں' ان کی تعبیر وتشریح کے لیے خطابی منہج واسلوب کی پوری گنجائش موجود ہے۔ چنانچہ ''تفسیری خطابت'' کا عکس ہر صفحہ میں نمایاں ہو رہا ہے۔ تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل سات حصوں کے اندر محفوظ بیانات چونکہ کسی حجرے یا لائبریری میں بیٹھ کر قلم بند نہیں کیے گئے ہیں' بلکہ انسانی اَنبوہ/ مجمع عام کے سامنے پیش کردہ خطابات کی صورت میں منظر عام پر آئے ہیں' اس لیے خطابت اور سماعت کی جملہ ضرورتوں کی تکمیل از خود ہوگئی ہے۔ یعنی اس کے اندر معاصر حالات کا تجزیہ وتنقید ہے' روحانیت ومادیت کی کشمکش اور سائنسی اکتسابات کا اظہار ہے' معاصر اردو مفسّرین سے اخذ واستفادہ اور جدید دور کے سماجی' سیاسی' معاشی' تعلیمی' نفسیاتی اور روحانی ومادی رجحانات میں ''خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَاکَدَرَ'' کے فلسفہ کی معرکہ آرائی اور جھلک بھی!

درحقیقت بیان القرآن ''دورۂ ترجمہ قرآن'' کی شکل میں ایک سو آٹھ (۱۰۸) گھنٹوں پر مشتمل ریکارڈنگ کی صورت میں محفوظ تھا' جس کی پہلی جلد ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کی زندگی میں شائع ہوئی اور موصوف مدرّس گرامی اس ''پہاڑ ایسا بھاری کام'' کی تکمیل کی آرزو لے کر دنیا سے رخصت ہوگئے' جسے ان کے محبان نے نہایت جاں فشانی اور جذبہ صادق سے پایہ تکمیل کو پہنچا کر موصوف گرامی کی روح کو سکون پہنچانے کا انتظام کیا۔ فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء۔

''بیان القرآن'' کا ایک نمایاں پہلو ربطِ آیات وسُور ہے اور اس ضمن میں ایک طرف ہر سورہ کے تمہیدی کلمات میں نظم کلام کی منظر کشی کرتے ہیں' دوسری جانب ''نظم قرآن'' کی وضاحت ہر رکوع یا ہر نئے مضمون کی ابتدا وانتہا میں کرتے جاتے ہیں' جو بظاہر قند مکرر لگتا ہے' لیکن اس کی دلکشی اور ضرورت سے انکار ممکن نہیں۔ دوسری طرف مبہمات مسائل جو آیاتِ بیّنات میں مخفی اور گندھے ہوئے ہیں' ان کی چشم کشا اور معاصر تعبیرات' نیز قرآن کی آفاقی تعلیمات کو منقح کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس پورے عمل میں موصوف گرامی کی ذاتی آراء اور اجتہادات کا اظہار بھی ہوتا ہے اور غور وفکر کی نئی دنیا آباد ہوتی چلی جاتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد ''تحدیثِ نعمت'' کا ذکر جابجا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ کثرتِ تذکرہ خود نمائی کے مقام تک

پہنچتا نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی جو مولانا امین احسن اصلاحی کے غایت درجہ معتقد تھے اور مجھ سے شدید اختلاف رکھتے تھے' انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا: ''یہ بات بہرحال ماننی پڑتی ہے کہ آپ کے درس سے بالکل خالی ہاتھ کوئی بھی نہیں اٹھتا۔ ہر شخص ضرور کچھ نہ کچھ لے کر اٹھتا ہے۔'' ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم اس اعتبار سے بھی ہوا کہ اس نے مجھے کسی ایک کی لکیر کا فقیر ہونے سے بچالیا۔ چنانچہ قرآن کے علم وفہم کے ضمن میں میرے استفادے کا حلقہ بہت وسیع بھی ہے اور بعض اعتبارات سے تضادات کا حامل بھی۔''(۲۹)

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ مدرّسِ گرامی نے اپنے ذاتی علم ومعرفتِ قرآن کے ''حوض'' میں تفسیرِ قرآن کے چار سلسلوں کا ذکر کیا ہے جن کی نہروں سے مسلسل پانی آتا رہا' جن پر پانچواں اضافہ ان کی تعلیم میں شامل علومِ طبیعیہ کے مبادیات ہیں۔ نیز تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنے منطقی ذہن کو ''تجمیع وتوافق'' (synthesis) کے لیے کلیدی قرار دیتے ہیں۔ ان چار سلسلوں کی وضاحت میں حضرت شاہ ولی اللہ' علامہ محمد اقبال' سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اور حمید الدین فراہی کے علمی احسانات کا ذکر جا بجا کرتے ہیں۔ وہ اپنی بابت تحریر کرتے ہیں:

''ایک مستند ''عالم دین'' نہ ہونے کے باوجود مجھے درس وتدریس قرآن کی جرأت وہمت رسولِ اکرم ﷺ کے قولِ مبارک ''بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً'' یعنی پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت' نے عطا کی ہے۔ چنانچہ میرے نزدیک جن علومِ دینی کی تحصیل کو علماءِ کرام لازمی قرار دیتے ہیں وہ کسی کے ''مفتی'' بننے کے لیے تو لامحالہ لازمی ہیں' لیکن قرآن کا داعی اور مبلّغ بننے کے لیے ہرگز ضروری نہیں ہیں۔''(۳۰)

ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باحمیت داعی ومبلّغ اسلام ہیں۔ ان کی اس ایمانی حرارت کو علّامہ اقبال کے اشعار نے شعلہ زن کیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی ذلت ونکبت کے اسباب کو جب اُمّتِ مُسلمہ پر منطبق کرتے ہیں تو کبھی کبھی ان کی ایمانی حرارت' شدّت پسندی کو آنچ دینے لگتی ہے۔ مثلاً ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ﴾ (البقرۃ:۶۱) ''اور ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے'' کی تشریح میں کہتے ہیں: ''جو قوم دنیا میں اللہ کے قانون' اللہ کی ہدایت اور اللہ کی کتاب کی امین ہوتی ہے وہ اللہ کی نمائندہ (representative) ہوتی ہے' اور اگر وہ اپنے عمل سے غلط نمائندگی (misrepresent) کرے تو اللہ کے نزدیک کافروں سے بڑھ کر مغضوب اور مبغوض ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ کافروں کو دین پہنچانا تو اس مسلمان اُمّت کے ذِمّہ تھا۔ اگر یہ خود ہی دین سے منحرف ہو گئے تو کسی اور کو کیا دین پہنچائیں گے! آج اس مقام پر موجودہ اُمّتِ مُسلمہ کھڑی ہے کہ تعداد میں ڈیڑھ ارب ہونے کے باوجود ان کے حصے میں عزت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔'' اس کے بعد G-7' G-9 یا G-15 میں کسی مسلمان ملک کے شامل نہ ہونے پر نوحہ کرتے ہیں۔ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے' لیکن پاکستان اس کے لیے بھارت سے جنگ کو تیار نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ذلت ومسکنت ہے جو آج ہم پر تھوپ دی گئی ہے۔(۳۱)

راقم کا خیال ہے کہ ایک مدرّسِ قرآن کو پڑوسی ممالک کے ساتھ آخر وقت تک نصح وخیر خواہی کا معاملہ کرنا چاہیے۔ انتہائی حساس مسائل کو حل کرنے کے لیے جنگ وحرب کے بجائے گفت وشنید پر اپنے محبّان اور عام مسلمانوں نیز حکومتی عمائدین کو قائل کرنا چاہیے۔ جذباتیت اور شدّت پسندی کو فروغ دینے والا اسلوب ایک مدرس ومصلح کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ مناسب ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس قسم کے جذباتی اور غیر معتدل بیانات کو محو کر دیا جائے۔

دوسری بات یہ کہ بیان القرآن کے علمی خزانے سے استفادۂ عام کو مزید وسعت وتقویت مل سکتی ہے اگر شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی لاہور اور تنظیم اسلامی کے اکابرین چند امور پر توجہ دیں۔ مثلاً اوّل یہ کہ ترجمہ قرآن کو تفسیر سے الگ کر کے اور مختصر حواشی کو شامل کر کے خود کفیل بنا کر چھاپ دیں۔ یہ مختصر بیان القرآن ایک ہی جلد میں آسکتا ہے۔

دوم یہ کہ ساتوں حصوں میں الگ الگ اشاریے اور انڈکس تیار کیے جائیں تاکہ موضوعات فرہنگ کے ذریعہ ریسرچ وتحقیق کے طلبہ اس سے مزید استفادہ کر سکیں۔

سوم یہ کہ یونیورسٹی اور کالج کے انگریزی طلبہ واساتذہ کے درمیان مزید استفادہ کی خاطر اسے انگریزی کا قالب عطا کریں تاکہ مغربی محقّقین اور انگریزی دان مسلمان دونوں کے لیے اس قیمتی علمی ورثے سے اپنا رشتہ جوڑنا ممکن ہو سکے۔

○○○

حواشی وتعلیقات

(۱) واضح رہے کہ ان کے یہ اعتراضات پاکستان کے تناظر میں تھے، ورنہ جماعت اسلامی بھارت نے دعوتِ دین کو آج بھی اپنی ترجیحات میں اول مقام دیا ہے۔ البتہ تقسیم ہند کے بعد قدیم تحریکی لٹریچر کو ضروری حاشیہ لگا کر از سرِ نو مرتب کرنے اور نئے محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سیکولر بھارت میں اقلیت واکثریت اور ظالم ومظلوم کے بیانیے کی بنیاد پر بھی غور کر کے نشانِ منزل متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بحث آج فقہ الاقلیات کا خصوصی موضوع ہے۔

(۲) ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیم اسلامی کی تفصیلات کے لیے رجوع کریں: ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیم اسلامی: ایک تعارف، ناشر انجمن خدام القرآن، سندھ، کراچی، ۲۰۱۲ء۔ تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ، ناشر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۲۰۰۵ء۔ مولانا مودودی مرحوم اور میں، مکتبہ خدام القرآن لاہور، ۲۰۰۶ء۔ مزید دیکھیں: بہاول پور یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں جمع کردہ ڈاکٹر غلام حیدر کا ڈاکٹر اسرار احمد پر پی ایچ ڈی کا مقالہ ۲۰۱۳ء کا عنوان ہے: An Analytical Study of the Quranic Services and Thought of Dr. Israr Ahmad۔ انگریزی زبان میں تحریر کردہ یہ مقالہ ۶/ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈاکٹر محمد اقبال، ابوالکلام آزاد، سیّد مودودی، حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی کو اسرار احمد صاحب کی قرآنیات کا مآخذ قرار دیا گیا ہے۔ اس مقالے میں بہت تفصیل کے ساتھ اسرار صاحب کی تنظیمی خدمات، پاکستان اور دیگر علاقوں پر اس کے اثرات اور

ان کی حیات کا باریک بینی سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس مقالہ میں بیان القرآن کا تقابلی مطالعہ سیّد مودودی، امین احسن اصلاحی اور پیر محمد کرم شاہ سے کیا گیا ہے۔

(۳) تقدیم، در بیان القرآن، حصّہ اوّل، مکتبہ خدام القرآن لاہور، ص ۵ تا ۸

(۴) کلمۂ تشکّر در بیان القرآن، حصّہ ۷، ص ۵۵۹۔کلمۂ تشکّر پر ۱۷؍رمضان/ ۵؍جون ۲۰۱۵ء کی تاریخ تحریر کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ سورۃ الناس کی اختتامی نشست دورۂ ترجمہ قرآن، جامع مسجد قرآن اکیڈمی ڈیفنس، کراچی کی تاریخ ۲۶؍رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ/ ۲۶؍جنوری ۱۹۹۸ء ہے۔

(۵) بیان القرآن حصّہ ہفتم، پیش لفظ، ص ۵

(۶) بیان القرآن، حصّہ اول، ص ۳۹، ۴۰۔ پورے قرآن کی سات منزلوں کی تفصیل ان صفحات کے اندر درج ہے۔ محققین/ شائقین ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

(۷) محولہ بالا، ص ۴۱

(۸) اس مقام پر متعدّد شعبوں کے احیاء کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں۔ رجوع کریں موصوف کا کتابچہ 'مسلمان پر قرآن مجید کے حقوق۔ یہ کتابچہ اسلامائزیشن آف کالج کے قضیے کی گرہیں کھولتا ہے۔ بیان القرآن، حصّہ اول، ص ۹۶ تا ۹۸

(۹) بیان القرآن، مکتبہ خدام القرآن لاہور، حصّہ اول، ص ۱۲۳، ۱۲۴

(۱۰) بیان القرآن، محولہ بالا، حصّہ ہفتم، ص ۳۱۹

(۱۱) محولہ بالا، ص ۱۴۹، ۱۵۰

(۱۲) محولہ بالا، ص ۱۵۲، ۱۵۳

(۱۳) محولہ بالا، ص ۱۵۴، ۱۵۵

(۱۴) محولہ بالا، حصّہ اول، ص ۲۳۵

(۱۵) محولہ بالا، حصّہ ہفتم، ص ۳۴۴

(۱۶) محولہ بالا، ص ۱۸۵

(۱۷) محولہ بالا، حصّہ اول، ص ۱۳۰

(۱۸) محولہ بالا، حصّہ ہفتم، ص ۱۲۴، ۱۲۵

(۱۹) محولہ بالا، ص ۴۹۰

(۲۰) محولہ بالا، حصّہ ہفتم، ص ۴۴۴

(۲۱) محولہ بالا، ہفتم، ص ۲۳۵

(۲۲) محولہ بالا، حصّہ اول، ص ۱۱۹

(۲۳) محولہ بالا، ص ۱۲۰

(۲۴) محولہ بالا، حصّہ ہفتم، ص ۵۵۲۔ یہ ترتیب معکوس متعدد جگہوں پر واضح کرتے ہیں، مثلاً سورۃ الواقعۃ آیت ۵۶، دیکھیں حصّہ ہفتم، ص: ۱۰۵

(۲۵) محولہ بالا، حصّہ ہفتم، ص ۵۵۲

(۲۶) محولہ بالا، حصّہ اول، ص ۲۴۱، ۲۴۲

(۲۷) محولہ بالا، حصّہ ہفتم، ص ۳۸۸

(۲۸) محولہ بالا، حصّہ دوم، ص ۲۵۳

(۲۹) محولہ بالا، حصّہ اول، تقدیم، ص ۶

(۳۰) محولہ بالا، ص ۶، ۷

(۳۱) محولہ بالا، حصّہ اول، ص ۱۷۳، ۱۷۴

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں،
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔(ان شاء اللہ!)

مِلاکُ التأوِیل (۲۴)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ الاعراف

(۱۴۰) آیات ۱۰۹۔۱۱۳

﴿قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ.....﴾

''فرعون کی قوم میں سے سرداروں نے کہا: بے شک یہ تو جادوگر ہے' علم رکھتا ہے' اور چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کر دے' تو پھر تم کیا حکم دیتے ہو؟ انہوں نے کہا: آپ اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دیجیے اور شہروں میں ہرکاروں کو بھیج دیجیے کہ وہ آپ کے پاس لے آئیں سب جادوگر علم رکھنے والے۔ اور پھر جادوگر فرعون کے پاس چلے آئے....''

اور سورۃ الشعراء کی آیات ۳۴۔۳۸ میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ.....﴾

''(فرعون) نے اپنے اردگرد سرداروں سے کہا: بے شک یہ شخص تو جادوگر ہے' علم رکھتا ہے' اور چاہتا ہے کہ تمہیں اپنے جادو سے تمہاری ہی زمین سے بے دخل کر دے' تو پھر تم کیا حکم دیتے ہو؟ انہوں نے کہا: اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دیں اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیں تا کہ وہ ہر علم رکھنے والے جادوگر کو حاضر کر سکیں۔ اور پھر جادوگروں کو جمع کیا گیا.....''

یہاں چار سوال اُبھرتے ہیں:

(۱) سورۃ الاعراف میں کہا: ''قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ'' قومِ فرعون میں سے سرداروں نے کہا۔ اور سورۃ الشعراء میں اس قول کی نسبت فرعون کی طرف کی گئی ''قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗ''

(۲) سورۃ الشعراء میں بہ نسبت سورۃ الاعراف کے ''بِسِحْرِہٖ'' (اپنے جادو کے ساتھ) کا اضافہ ہے؟

(۳) سورۃ الاعراف میں پیغامبر بھیجے جانے کے لیے لفظ ''اَرْسِلْ'' آیا ہے اور سورۃ الشعراء میں ''اِبْعَثْ'' لایا گیا ہے؟

(۴) دونوں سورتوں میں: ﴿یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ/سَحَّارٍ عَلِیْمٍ ○﴾ (وہ تمہارے پاس جادوگر لے آئیں گے علم رکھنے والے) کے بعد کی عبارت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوا: ﴿وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ﴾ ''اور جادوگر فرعون کے پاس چلے آئے'' لیکن سورۃ الشعراء میں یہ بیان تفصیل سے آیا ہے۔ فرمایا: ﴿فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ وَّقِیْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''تو تمام جادوگر ایک معیّنہ دن جمع کیے گئے۔ لوگوں سے بھی کہا گیا کہ تم بھی حاضر رہو اور اگر جادوگر غلبہ حاصل کر سکیں تو پھر ہم ان کی پیروی کر سکیں گے۔'' اور اس کے بعد فرمایا: ﴿فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ﴾ ''اور پھر جب جادوگر آ گئے .....''

اب ان چاروں سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا' جیسا کہ سورۃ ہود میں ارشاد فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ﴾ ''اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی آیات اور روشن دلیل کے ساتھ' فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف'' اور جب انہوں نے فرعون اور اس کے سرداروں کو معجزات دکھائے اور اللہ کی طرف بلایا تو نہ صرف فرعون سے بلکہ اس کے سرداروں سے بھی مکالمہ ہوا تو سب نے کہا کہ یہ تو بہت دانا قسم کے جادوگر ہیں۔ اور پھر فرعون نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا' سرداروں نے بھی فرعون کی متابعت میں ایک دوسرے سے وہی باتیں کہیں جو فرعون نے اُن سے کہی تھیں۔ اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دونوں سورتوں میں اختلافِ بیان کیوں ہے؟ یعنی سورۃ الاعراف میں بتایا گیا کہ سرداروں نے کلام کیا تھا اور سورۃ الشعراء میں کہا گیا کہ فرعون نے سرداروں سے مشورہ طلب کیا تھا۔ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ سورۃ الاعراف میں یہ کہا گیا تھا: ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ﴾ (آیت ۱۰۳) ''پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔''

اور اس کے مقابلے میں سورۃ الشعراء میں صرف فرعون کے پاس جانے کا ذکر ہے: ﴿فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ﴾ (آیت ۱۶) ''تو پھر فرعون کے پاس تم دونوں جاؤ!'' اس لیے مناسب تھا کہ جہاں فرعون ہی کا ذکر ہے وہاں جواب میں بھی فرعون سے آغاز کیا جائے' جیسا کہ سورۃ الشعراء میں ہے: (قَالَ فِرْعَوْنُ: فرعون نے کہا) اور جہاں اس کے سرداروں کا بھی ذکر ہے تو وہاں جواب میں سرداروں کا بھی ذکر کر دیا جائے' جیسا کہ سورۃ الاعراف کی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ گویا کلام کچھ یوں ہے: ''اور سرداروں کی طرف بھی بھیجا گیا تھا اور ان سے بھی بات چیت کی گئی تو وہ بول اُٹھے'' یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب سورۃ الاعراف میں پہلے فرعون کا ذکر ہے اور بعد میں اس کے

سرداروں کا (اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِہٖ) تو کلام کی نسبت اُسی کی طرف کی جانی چاہیے تھی‘ چونکہ اصل مخاطب تو وہی تھا‘ سردار تو خود اس کے تابع تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جواب میں صرف یہ کہا جاتا کہ ’’قَالَ فِرۡعَوۡنُ‘‘ تو پھر یہ جاننے کی خواہش باقی رہ جاتی کہ سرداروں نے کیا کہا ہوگا‘ کیونکہ وہ بھی تو مخاطب تھے؟ ان کے جواب کا دیا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ وہی بات کہیں گے جو وہ اپنے آقا سے سنیں گے‘ اور سورۃ الشعراء سے ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ بات کہنے والا اصلاً فرعون ہی تھا (قَالَ لِلۡمَلَاِ حَوۡلَہٗۤ)۔

اور اس بات کا بھی خیال رہے کہ اگر سرداروں کی بات ذکر نہ کی جاتی (جو کہ فرعون کی بات کا ہی عکس تھی) تو یہ گمان ہوسکتا تھا کہ انہوں نے بھی جادوگروں کی طرح حق کو پہچان لیا تھا اور وہ بھی فرعون کی مخالفت پر آمادہ تھے۔ اب جبکہ انہوں نے بھی وہی بات کہی جو فرعون کہہ رہا تھا تو یہ ابہام دور ہوگیا کہ ان کے دلوں میں فرعون کے خلاف ذرہ برابر بغاوت کا خیال نہ تھا۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ سورۃ الشعراء میں صرف فرعون کے جواب کا ذکر ہے‘ سرداروں کا نہیں‘ تو ایسا کیوں ہے؟ جواباً ہم کہیں گے کہ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ ’’موسیٰ تو ایک باعلم جادوگر ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے بے دخل کردیں‘‘ تو اس بات کی نسبت فرعون کی طرف بھی کی گئی اور سرداروں کی طرف بھی کی گئی‘ تو جیسے ہم نے کہا کہ سردار تو فرعون کے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ کیا کہتا ہے‘ اور سورۃ الشعراء کے حوالے سے معلوم ہوا کہ وہ فرعون کے مافی الضمیر کو جان چکے تھے‘ اس لیے انہوں نے بالکل وہی بات کہی جو فرعون نے کی تھی۔ لیکن جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ ’’موسیٰ اور ان کے بھائی کو مہلت دیں اور آپ شہروں میں ہرکارے بھیج کر جادوگروں کو اکٹھا کریں‘‘ تو یہ بات تو صرف سرداروں ہی نے کہی تھی‘ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ سورۃ الشعراء میں صرف ’’قَالَ فِرۡعَوۡنُ‘‘ کیوں کہا گیا‘ سرداروں کا حوالہ کیوں نہیں دیا گیا؟ نہیں! ان کا ذکر تو بعد میں آ رہا تھا‘ جو کچھ انہوں نے کہا وہ سورۃ الاعراف میں بھی ذکر کیا گیا اور سورۃ الشعراء میں بھی۔ اور اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں سورتوں کا نظم کلام اپنی اپنی جگہ بالکل درست ہے‘ اور اگر اس کا اُلٹ کیا جاتا تو وہ مناسب نہ ہوتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا ﴿۸۲﴾﴾ (النساء)

’’اور اگر یہ کلام اللہ کے سوا کسی اور کا ہوتا تو وہ لوگ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔‘‘

(۲) دوسرا سوال یہ تھا کہ سورۃ الشعراء میں جہاں قولِ فرعون نقل کیا گیا ہے وہاں ’’بِسِحۡرِہٖ‘‘ کا اضافہ ہے‘ یعنی وہ اپنے جادو کے زور پر تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرعون تو موسیٰ علیہ السلام کا سخت دشمن ہو چکا تھا۔ اُس نے نہ صرف یہ کہا کہ موسیٰ تو ایک خوب علم والا جادوگر ہے‘ بلکہ اس پر اضافہ بھی کیا کہ واقعی وہ جادوگر ہی ہے اور جادو کے زور پر ہی تمہیں تمہارے آباء واَجداد کی زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس نے یہ اس لیے بھی کہا کہ سردار حضرات اس کی بات کا یقین کریں اور اس کا ساتھ دیں۔ اس کے مقابلے میں جب سرداروں نے آپس میں بات چیت کی تو انہوں نے اس مرحلہ پر ’’بِسِحۡرِہٖ‘‘ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ اُس وقت تک

وہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں زیادہ نہ جانتے تھے‘ برخلاف فرعون کے جو اپنے تکبر اور غرور کی بنا پر جو کچھ منہ میں آ رہا تھا کہے چلا جا رہا تھا۔ ملاحظہ ہو کہ ’’بِسِحْرِہٖ‘‘ کا اضافہ سورۃ طٰہٰ میں بھی نقل کیا گیا ہے: ﴿قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝۵۷﴾ (طٰہٰ) ’’فرعون نے کہا: اے موسیٰ! کیا تم اس لیے آئے ہو کہ اپنے جادو ٹونے سے ہمیں ہماری ہی زمین سے نکال باہر کرو؟‘‘ البتہ سورۂ طٰہٰ کی اگلی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرداروں نے بھی بالآخر یہ بات کہہ ڈالی: ﴿قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا...﴾ (آیت ۶۳) ’’سرداروں نے کہا: یہ دونوں بے شک جادوگر ہیں جو چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنے جادو کے زور پر تمہاری ہی زمین سے بے دخل کر دیں...‘‘ لیکن سرداروں نے یہ بات بعد کے مرحلے میں کہی جبکہ فرعون کے ساتھ ان کی مشاورت عمل میں آئی‘ آپس میں اختلاف بھی ہوا اور پھر سرگوشیاں بھی ہوئیں کہ موسیٰ اور ہارون کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ اس ساری بات کو ان آیات میں ملاحظہ فرمائیں: ﴿فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ۝۶۰﴾ ’’پھر فرعون پیچھے ہٹا‘ اپنے مکروفریب کو اکٹھا کیا اور پھر پلٹا‘‘۔ ﴿فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ۝۶۲﴾ ’’پھر یہ آپس میں اختلاف رائے کا شکار ہو گئے اور چھپ چھپ کر سرگوشیاں کرنے لگے۔‘‘ اور ظاہر ہے کہ اختلافِ رائے کی صورت میں فرعون ہی کی بات مانی گئی ہوگی اور دراصل یہ قول اسی کا تھا‘ لیکن سردار بھی اس کے قائل ہوتے چلے گئے تھے!! ہم اس بات کا اعادہ ایک دفعہ پھر کر دیں کہ جہاں تک سورۃ الاعراف کی آیت کا تعلق ہے تو وہ صرف سردار حضرات ہی کا قول نقل کیا گیا ہے‘ نہ کہ فرعون کا۔

(۳) تیسرا سوال لفظ ’’ارسل‘‘ (سورۃ الاعراف) اور ’’بعث‘‘ (سورۃ الشعراء) کے بارے میں تھا‘ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ مصحف کی ترتیب میں الفاظ کے چناؤ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ’’اَرْسَلَ‘‘ خاص ہے اور ’’بعث‘‘ عام۔ یعنی اِرسال میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے چاہے وہ حقیقتاً ہو یا بمعنی مجاز ہو‘ لیکن ’’بَعَثَ‘‘ میں قیامت کے دن اٹھائے جانے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے‘ تو قرآنی ترتیب کے لحاظ سے پہلے وہ لفظ لایا گیا جس میں بھیجے جانے کا مفہوم خصوصی طور پر پایا جاتا ہے اور پھر اس کے بعد عمومی لفظ لایا گیا تاکہ عبارت میں تنوّع بھی پیدا ہو سکے۔ اس کی نظیر کے طور پر ہم بطور مثال عرض کرتے ہیں کہ جیسے تَبِعَ اور اِتَّبَعَ اور يُذَبِّحُوْنَ اور يُقَتِّلُوْنَ کے الفاظ اسی ترتیب کے لحاظ سے لائے گئے ہیں۔

(۴) چوتھا سوال یہ تھا کہ سورۃ الاعراف میں ﴿يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝﴾ کے فوراً بعد کہا گیا: ﴿وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ﴾ ’’اور جادوگر فرعون کے پاس چلے آئے‘‘۔ لیکن سورۃ الشعراء میں ﴿فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ﴾ (جب جادوگر آ چکے) کے الفاظ سے پہلے جادوگروں کے جمع ہونے اور لوگوں کے جمع کیے جانے کا ذکر کیا گیا‘ فرمایا:

﴿فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۳۸ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۝۳۹ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝۴۰﴾

تو اس ضمن میں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ سورۃ الاعراف میں اختصار ہے لیکن سورۃ الشعراء میں تفصیل ہے۔ یعنی جب

یہ کہا گیا کہ ہرکاروں کو بھیج دیا جائے کہ وہ تمام شہروں سے جادوگروں کو لے کر آئیں' تو کیا وہ فوراً چلے آئے یا ان کے آنے سے پہلے بھی کچھ مراحل طے کیے گئے تھے؟ سورۃ الشعراء میں بات کو کھول کر بیان کیا گیا کہ ہاں! جادوگروں کو جمع کیا گیا' بلکہ لوگوں میں بھی منادی کی گئی کہ اکٹھے ہو جاؤ اور اگر جادوگر غالب آ گئے تو پھر ہم انہی کے راستے پر چلیں گے۔ اور یہاں ہم اس قاعدے کا بھی اعادہ کر دیں جو ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ اگر ایک سورت میں اختصار ہو تو وہاں الفاظ کم استعمال کیے جاتے ہیں اور جہاں تفصیل ہو تو وہاں الفاظ میں بھی فراوانی ملحوظ رہتی ہے۔

اب ملاحظہ ہو کہ سورۃ الاعراف میں آیت ۱۰۳ سے موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا آغاز ہوتا ہے اور پھر گیارہویں آیت (۱۱۳) میں ﴿وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ﴾ کے آغاز سے جادوگروں کی آمد کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں سورۃ الشعراء کی آیت ۱۰ سے موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ شروع ہوتا ہے اور پھر ۳۱ویں آیت (نمبر ۴۱) میں جادوگروں کی آمد کا تذکرہ کیا گیا: ﴿فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ﴾ گویا سورۃ الاعراف میں اختصار ہے اور سورۃ الشعراء میں تفصیل ہے۔

(۱۴۱) آیت ۱۱۳

﴿وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾

''اور جادوگر فرعون کے پاس آئے اور کہا: کیا ہمیں کچھ اجرت ملے گی اگر ہم غالب آ گئے؟ تو اُس نے کہا: ہاں! اور تم میرے قریب ترین (درباریوں) میں سے ہو جاؤ گے۔''

اور سورۃ الشعراء کی آیت ۴۱ میں ارشاد ہوا:

﴿فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾﴾

''اور جب جادوگر آ پہنچے تو انہوں نے فرعون سے کہا: کیا ہمیں کچھ اجرت ملے گی اگر ہم غالب آئے؟ اُس نے کہا: ہاں! اور تم پھر قریب ترین (درباریوں) میں سے ہو جاؤ گے۔''

یہاں دیکھا جا سکتا ہے کہ سورۃ الشعراء میں دو لفظ ایسے آئے ہیں جو سورۃ الاعراف میں نہیں وارد ہوئے: ایک تو ''اِذًا'' اور دوسرے ''لَمَّا''۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ''اِذًا'' بطور جواب اور جزاء ذکر کیا جاتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں بھی ''نَعَمْ'' کہہ کر جواب دے دیا گیا ہے' لیکن جیسے کہ ہم نے پہلے ذکر کیا' چونکہ سورۃ الشعراء میں طوالتِ بیان ہے اس لیے وہاں ''نَعَم'' کے بعد ''اِذًا'' کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ بعینہٖ یہی بات ''لَمَّا'' کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے' کہ گو سورۃ الاعراف میں کلام کا آغاز ''لَمَّا'' سے نہیں ہوا لیکن بات وہی ہے جو سورۃ الشعراء میں کہی گئی۔ اور وہ اس لیے کہ سورۃ الشعراء میں طوالتِ بیان ہے تو وہاں ''لَمَّا'' کا اضافہ کر دیا گیا' اور یہ ایسے ہی ہے جیسے سورۃ یوسف میں برادرانِ یوسف کی آمد کا ذکر ہے: ﴿وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ .....﴾ ''اور وہ بوقت عشاء اپنے والد کے پاس روتے ہوئے آئے' کہا کہ اے ہمارے باپ!'' یہاں بھی شروع میں ''لَمَّا'' لایا جا سکتا تھا' یعنی جب وہ اپنے والد کے پاس آئے' لیکن اس کے بغیر بھی کلام میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔

(۱۴۲) آیت ۱۱۵

﴿قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ ﴿۱۱۵﴾﴾

''انہوں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو تم (اپنا عصا) ڈالو یا ہم ڈالنے والوں میں سے ہو جائیں۔''

اور سورۃ طٰہٰ کی آیت ۶۵ میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی ﴿۶۵﴾﴾

''انہوں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو تم ڈالو یا ہم سب سے پہلے ڈالنے والوں میں سے ہو جائیں۔''

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

دونوں عبارتوں کے آخری فقرے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ہر سورت کا اندازِ بیان کیا اس کے ساتھ خصوصی حیثیت رکھتا ہے؟ پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ عین ممکن ہے کہ یہ واقعہ ایک دفعہ نہیں' ایک سے زائد مرتبہ پیش آیا ہو' یا پیش تو ایک ہی دفعہ ہوا ہو لیکن جادوگروں کی اپنی بات میں تکرار تھی' یعنی ایک نے یہ کہا اور دوسرے نے یہ کہا۔ یا یوں کہا جائے کہ لغات میں اختلاف ہو سکتا ہے' یہاں ایک بات نقل کی جا رہی ہے جو کہ مصریوں نے اپنی زبان میں کہی تھی' اس لیے عربی میں اس کی ادائیگی میں تنوع سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس لیے مذکورہ اعتراض کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اور دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ ہر سورت کے فواصل (یعنی آیت کا آخری لفظ) دیکھئے' تو اندازہ ہو گا کہ دونوں سورتوں میں آیت کا اختتام اس کے اپنے فواصل کے اعتبار سے ہو رہا ہے' اور اگر اس کا اُلٹ کیا جاتا تو قطعاً مناسب نہ ہوتا۔ اور بعینہ یہی جواب اگلے نمبر (۱۴۳) کا بھی ہے کہ ان دونوں آیات کا اختتام مختلف کیوں ہے؟

(۱۴۳) آیات ۱۲۱۔۱۲۲

﴿قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾﴾

''انہوں نے کہا: ہم تمام جہانوں کے رب پر ایمان لائے' جو کہ موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔''

اور ایسے ہی سورۃ الشعراء (آیت ۴۸) میں ہے۔ لیکن سورۃ طٰہٰ میں یوں ارشاد ہوا:

﴿قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی ﴿۷۰﴾﴾

''انہوں نے کہا: ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے۔''

(۱۴۴) آیت ۱۲۳

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ﴾

''فرعون نے کہا: تم اس پر ایمان لے آئے اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دیتا۔''

اور سورۃ طٰہٰ کی آیت ۷۱ اور الشعراء کی آیت ۴۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ﴾

''اُس نے کہا: تم اس پر ایمان لے آئے اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دیتا۔''

یہاں دوسوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) سورۃ الاعراف میں ''قَالَ فِرْعَوْنُ'' کہہ کر اُس کا نام ذکر کیا گیا جب کہ باقی دونوں سورتوں میں صرف ''قَالَ'' کہا گیا' یعنی اس کا نام صریحاً نہیں لایا گیا؟

(۲) سورۃ الاعراف میں ''اٰمَنْتُمْ بِهٖ'' میں ضمیر باء کے ساتھ لائی گئی اور باقی دونوں سورتوں میں لام کے ساتھ لائی گئی (یعنی اٰمَنْتُمْ لَهٗ)۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الاعراف میں اس قصے کا آغاز فرعون کے سرداروں کی بات سے ہوتا ہے: ''قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ''۔ گویا بتایا جا رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی نشانی کو ردّ کرنے والے یہی لوگ تھے۔ اور پھر ''رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ'' تک سلسلہ کلام کی نسبت انہی کی طرف کی جا رہی ہے' تو مناسب تھا کہ ''اٰمَنْتُمْ بِهٖ'' کے قول کی نسبت صراحتاً فرعون کی طرف کی جاتی' چونکہ اس کا ذکر پہلے نہیں آیا تھا' گو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قول اُسی کا تھا' چاہے اسے خبر کی حیثیت سے لیا جائے یا استفہام شمار کیا جائے۔ اور اس کے نام کی صراحت اس لیے بھی ضروری تھی تا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ قول کسی اور کا بھی ہو سکتا ہے۔

اور اب ملاحظہ ہوں' سورۂ طٰہٰ کی آیات جہاں آغازِ کلام سے بار بار فرعون کا نام آ رہا ہے' موسیٰ علیہ السلام کو کہا جا رہا ہے: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾﴾ ''فرعون کی طرف جاؤ' اُس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔'' پھر موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کو مخاطب کر کے کہا گیا: ﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾﴾ ''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ' اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔'' پھر فرعون کے ان دونوں سے سوالات ذکر کیے گئے: ﴿فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾﴾ اور پھر دوبارہ سوال کیا: ﴿فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾﴾ ''تو پچھلے زمانے والوں کا حال کیا ہوا؟'' اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں بتایا: ﴿وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾﴾ ''اور ہم نے اُسے اپنی تمام نشانیاں دکھائیں لیکن اُس نے جھٹلایا اور انکار کیا''۔ پھر اس کا یہ قول نقل کیا: ﴿قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾﴾ ''کہا: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمیں ہماری ہی زمین سے بے دخل کر دو اپنے جادو کے ساتھ اے موسیٰ!'' پھر کہا: ﴿فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾﴾ ''پھر فرعون پلٹا' اپنے ہتھکنڈے جمع کیے اور پھر آیا۔''

اب دیکھئے کہ ان تمام آیات میں یا تو فرعون کا نام کے ساتھ ذکر ہے یا ضمیر غائب کے ساتھ۔ اس کے سرداروں کا کہیں ذکر نہیں ماسوائے اس آیت کے: ﴿فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾ قَالُوْٓا.....﴾ ''تو پھر انہوں نے اپنے اس معاملہ میں اختلافِ رائے کیا اور چھپ چھپ کر سرگوشیاں کرنے لگے اور کہنے لگے.....'' اب جبکہ فرعون ہی کا ذکر بار بار آیا ہے چاہے ظاہری اسم کے ساتھ یا ضمیر غائب کے ساتھ تو یہاں ''قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ'' کہنے میں کوئی حرج نہیں تھا' یعنی یہاں ''قَالَ فِرْعَوْنُ'' کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ چونکہ اُسی کا ذکر چلا آ رہا ہے تو پھر اگر ضمیر غائب کے ساتھ بھی اس کا ذکر آ جائے تو کوئی التباس واقع نہیں ہوگا۔ اور

بعینہ یہی صورت حال سورۃ الشعراء میں بھی ہے کہ وہاں بھی فرعون کا ذکر بار بار آ چکا تھا' اور سرداروں کا ذکر بھی مخاطب کی حیثیت سے آیا ہے' فرمایا: ﴿قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗ﴾ ''اُس نے اپنے اردگرد سرداروں سے کہا''۔ تو وہاں بھی ''اٰمَنْتُمْ لَهٗ'' ہی کہا گیا' یعنی اس کے نام کے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ''اٰمَنْتُمْ بِهٖ'' میں حرف باء تصدیق کے معنوں میں ہے اور ''اٰمَنْتُمْ لَهٗ'' میں حرفِ لام اطاعت اور سپردگی کے معنوں میں ہے۔ سورۃ الاعراف چونکہ مقدّم ہے اس لیے وہاں وہ حرف لایا گیا جس میں تصدیق کا معنی پنہاں ہے جو کہ ایمان کا پہلا مطالبہ ہے اور باقی دونوں سورتوں میں وہ حرف لایا گیا جس میں اطاعت اور سپردگی عیاں ہوتی ہے جو کہ تصدیق کرنے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ گویا فرعون جادوگروں سے کہہ رہا ہے کیا تم اس کی تصدیق کے ساتھ ساتھ اس کی یہ بات بھی مانتے ہو کہ تم اس کے الٰہ کی پوری پوری اطاعت کرتے ہو؟ اور یوں جو بات وہ کہنا چاہتا تھا پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ گئی۔ واللہ اعلم!

(۱۴۵) آیت ۱۲۳

﴿فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ.....﴾

''اور عنقریب تم سب جان لو گے! میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹوا دوں گا.....''

اور سورۃ الشعراء کی آیت ۴۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۭ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ﴾

''اور تم یقیناً جان لو گے! میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دوں گا''

اور سورۂ طٰہٰ کی آیت ۷۱ میں ارشاد فرمایا:

﴿فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ﴾

''اور میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹوا دوں گا۔''

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: سورۃ الشعراء میں سَوْفَ سے پہلے لام کا اضافہ ہے؟ الاعراف میں یہ لام نہیں ہے۔ اور سورۂ طٰہٰ میں تو نہ لام ہے اور نہ ہی سَوْفَ ہے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟ جواباً عرض ہے کہ تینوں آیات میں ایک ہی مضمون بیان ہوا ہے اور وہ یہ کہ جب جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت کو جان لیا اور ان پر ایمان لے آئے تو فرعون کا غصہ دو آتشہ ہو گیا اور اُس نے انہیں سخت سزا کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں اور اسلوب قرآن کے مطابق جہاں کوئی بات زیادہ تفصیل سے بیان کی جا رہی ہو تو وہاں الفاظ میں زیادہ زور آ جاتا ہے۔

اب دیکھئے کہ سورۃ الشعراء میں یہ قصہ زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے تو یہاں سورۃ الاعراف کی طرح صرف ''فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ'' نہیں کہا گیا' بلکہ لام کے اضافے کے ساتھ ''فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ'' کہا گیا۔ دوسرے یہ کہ ''لام'' کا لایا جانا اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ جو دھمکی میں تمہیں دے رہا ہوں یہ ضرور ہو کر رہے گی۔ سورۂ طٰہٰ

میں سرے سے یہ لفظ نہیں آیا ہے، لیکن وہاں اس کمی کو 'نون تاکید مشدّد' لاکر پورا کیا گیا ہے۔ یعنی آیت کے آخر میں کہا: ﴿ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿٧١﴾ ﴾ ''اور یقیناً تم جان لوگے کہ ہم میں سے کس کی مار زیادہ سخت اور دیرپا ہے'' اور یہاں الفاظ کے چناؤ میں سورتوں کے اعتبار سے تدریج کا خیال رکھا گیا ہے۔ یعنی سورۃ الاعراف پہلی سورت ہے۔ اس کے بعد سورۂ طٰہٰ آتی ہے جس میں سورۃ الاعراف کی بہ نسبت زیادہ تاکیدی الفاظ ہیں اور اس کے بعد سورۃ الشعراء ہے جس میں مزید تاکیدی حرف لایا گیا ہے۔

(۱۴۶) آیت ۱۲۴

﴿ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٢٤﴾ ﴾

''پھر میں تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔''

لیکن سورۂ طٰہٰ (۷۱) اور الشعراء (۴۹) میں ثُمَّ کے بجائے یہی لفظ واؤ کے ساتھ آیا ہے: ''وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ'' حالانکہ دونوں جگہ ایک جیسی ہی دھمکی دی گئی ہے۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ اگر چند مذکورات کے درمیان ''واؤ'' لایا جائے تو ضروری نہیں کہ ان مذکورات کے درمیان تاخیر یا مہلت پائی جاتی ہو۔ اگر ''فاء'' لایا جائے تو ان کے آنے میں ترتیب مقصود ہوتی ہے لیکن ''ثُمَّ'' میں تو تاخیر کا پہلو غالب ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ''ثُمَّ'' دو طرح کے معانی رکھتا ہے۔ ایک تو زمانے کے اعتبار سے تاخیر کو ظاہر کرتا ہے، جسے نحوی حضرات ''مہلت'' کے پائے جانے سے تعبیر کرتے ہیں، اور دوسرا یہ کہ ''ثُمَّ'' کے بعد جو لفظ آرہا ہے، وہ خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ وہاں تاخیر زمانی کا قصد نہیں ہوتا بلکہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ اگر یہ صفت تنہا بھی ہوتی تو کافی ہوتی، جیسے ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے:

﴿ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾ ﴾ ''اُس نے سوچا اور اندازہ لگایا۔''

﴿ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ﴾ ''وہ مارا جائے! کیسا اندازہ اُس نے لگایا۔''

﴿ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾ ﴾ (المدثر) ''پھر وہ مارا جائے۔ کیسا اندازہ اُس نے لگایا۔''

اور سورۃ البلد کی آیات ۱۲ سے ۱۷ تک ان چند صفات کا تذکرہ ہوا جو ان لوگوں سے خاص ہیں جو ایک پُرمشقّت گھاٹی کو پار کرنا چاہتے ہیں، یعنی شیطان کے وسوسوں کو جھٹکتے جاتے ہیں اور جنت کی طرف جانے والی گھاٹی کو پار کرتے چلے جاتے ہیں۔ آغازِ کلام میں کہا:

﴿ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾ ﴾ ''تو کیوں نہ وہ گھاٹی پر چڑھتا گیا؟''

﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾ ﴾ ''اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟''

﴿ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾ ﴾ ''ایک گردن کو آزاد کرنا ہے۔''

﴿ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾ ﴾ ''یا بھوک والے دن کھانا کھلانا ہے۔''

﴿ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ ﴾ ''کسی یتیم کو جو رشتے دار ہے۔''

﴿ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿١٦﴾ ﴾ ''یا مسکین کو جو انتہائی خستہ حال ہے۔''

﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾﴾ ''پھر وہ ان لوگوں میں سے ہو جاتا ہے جو ایمان لائے' اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی۔''

یعنی پہلی دو صفات (غلام آزاد کرنا اور کھانا کھلانا) تو اس میں پائی جاتی ہیں لیکن اس سے بڑھ چڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ ایمان لانے والوں میں سے ہے اور صبر اور رحم کرنے کی تلقین کرنے والوں میں سے ہے۔ اور ایسے ہی سورۂ طٰہٰ میں ارشاد فرمایا: ﴿وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾﴾ ''اور اس نے نیک کام کیا اور پھر ہدایت یافتہ ہوا۔'' ان آیات میں ترتیب یا تاخیر زمانی مطلوب نہیں ہے بلکہ آخری صفت کی اہمیت اور عظمت کا اظہار کیا جا رہا ہے' جیسے سورۂ طٰہٰ کی اس آیت کا مطلب یوں ہوگا کہ وہ صرف عمل صالح سے ہی پہچانا نہیں جاتا بلکہ وہ تو ہدایت یافتہ بھی ہے۔

اب یہاں ملاحظہ ہو کہ سورۃ الاعراف میں جہاں یہ قصّہ بیان ہوا ہے وہاں ایک دل دہلا دینے والے واقعے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ خود موسیٰ علیہ السلام کو بھی تسلی کے الفاظ کہے گئے ہیں جن کا بیان سورۃ طٰہٰ میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: ﴿لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾﴾ ''ڈرو مت' تم ہی ان پر غالب رہو گے'' اور سورۃ الاعراف میں جادوگروں کے بارے میں ارشاد ہوا: ﴿وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾﴾ ''اور انہوں نے سب پر ہیبت طاری کر دی اور ایک بڑے جادو کا عمل کیا۔''

یہاں یہ بھی ملاحظہ ہو کہ سردارانِ فرعون نے جب جادوگروں کی شعبدہ بازی کو دیکھا تو وہ دھک کر کے رہ گئے اور اس زعم باطل میں گرفتار ہو گئے کہ آج تو ہماری جیت ہوگی' لیکن آخر میں جو کچھ ہوا وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ جادوگروں کے ایمان لے آنے پر ان کے ہوائی قلعے دھڑام سے زمین بوس ہو گئے۔ فرعون کے لیے یہ تمام ماجرا ایک حادثہ فاجعہ کی صورت اختیار کر گیا' اس لیے اس نے اول فول بکنا شروع کر دیا۔ وہ ایک طرف اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہا تھا تو دوسری طرف سردارانِ فرعون کی بھی اشک شوئی کرنا چاہتا تھا' اس لیے اس کی زبان سے مذکورہ الفاظ نکلے کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا ﴿ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾ یعنی سورۃ الاعراف کا موقع محل مذکورہ الفاظ کا تقاضا کرتا ہے جب کہ سورۃ الشعراء میں واؤ عاطفہ کا لانا ہی کافی تھا کہ وہاں الفاظ کی وہ شدت نہیں ہے جو کہ سورۃ الاعراف میں نظر آتی ہے۔ واللہ اعلم!

(۱۴۷) آیت ۱۲۵

﴿قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾﴾

''انہوں نے کہا کہ بے شک ہم اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں۔''

اور سورۃ الشعراء کی آیت ۵۰ میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۚ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾

''انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں! بے شک ہم تو اپنے ربّ کی طرف ہی پلٹنے والے ہیں۔''

سوال یہ ہے کہ سورۃ الشعراء میں ''لَاضَیْرَ'' کے الفاظ زائد ہیں۔اس کی کیا توجیہہ ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ ''لَاضَیْرَ'' کے الفاظ ''وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ'' کے مقابلے میں لائے گئے ہیں۔یعنی جادوگروں کا پہلے فرعون کی عزت کی قسم کھا کر یہ کہنا کہ ہم غالب رہیں گے اور پھر اپنی عاجزی اور ناکسی کو دیکھنا' انہیں اس بات کا ادراک سجھایا گیا کہ اصل عزّت اور قدرت تو اللہ ہی کی ہے اور جب یہ اعتقاد ان کے دل میں جاگزیں ہو گیا تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ''لَاضَیْرَ'' کہ ہمیں اب فرعون کا کوئی ڈر لاحق نہیں' کیونکہ اصل عزّت تو اللہ ہی کو حاصل ہے۔ چونکہ سورۃ الاعراف میں یہ لفظ (بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ) نہیں آیا تھا اس لیے وہاں اس کا مقابل لفظ نہیں لایا گیا۔واللہ اعلم!

(۱۴۸) آیت ۱۸۸

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚ﴾

''کہہ دیجیے کہ میں اپنی ذات تک کے لیے نفع یا نقصان کا مالک نہیں ہوں اِلّا یہ کہ جو اللہ چاہے۔اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو بہت زیادہ خیر اکٹھا کر لیتا۔''

اور سورۂ یونس کی آیت ۴۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾﴾

''کہہ دیجیے کہ میں اپنی ذات تک کے لیے کسی نقصان یا نفع کا مالک نہیں ہوں اِلّا یہ کہ جو اللہ چاہے۔ ہر اُمّت کے لیے ایک میعاد ہے اور جب وہ میعاد آ جاتی ہے تو وہ نہ ہی ایک ساعت پیچھے کیے جاتے ہیں اور نہ ہی آگے کیے جاتے ہیں۔''

یہاں سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ سورۃ الاعراف میں نفع کا پہلے ذکر کیا گیا ہے لیکن سورۂ یونس میں بعد میں ذکر کیا گیا ہے؟اور دوسری بات یہ کہ دونوں آیتوں کا اختتام الگ الگ جملوں پر ہوا ہے؟ پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ سورۃ الاعراف کی آیت سے قبل مشرکین کا یہ مطالبہ نقل ہوا ہے کہ بتاؤ! قیامت کب آئے گی اور پھر یہ الفاظ نقل کیے گئے:

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا ؕ﴾ (آیت ۱۸۷)

''وہ تم سے یوں سوال کرتے ہیں گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو۔''

ان کا اصرار اس بات کا غماز ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے رسول تو قیامت کے آنے کا علم جانتے ہیں لیکن انہیں بتانے پر آمادہ نہیں ہیں۔اور ظاہر ہے کہ ایسا علم جسے بھی ہو گا اس کے لیے نفع بخش ہو گا' تو نبی ﷺ نے یہ جواب دیا کہ وہ تمہیں کیا نفع پہنچا سکتے ہیں وہ تو خود اپنے لیے نہ کسی نفع کے مالک ہیں اور نہ ہی کسی نقصان کے۔ چونکہ ان کے سوال میں نفع کا حصول شامل تھا اس لیے جواب میں بھی نفع کا ذکر پہلے کیا گیا اور اللہ کے نبی ﷺ نے ان پر واضح کر دیا کہ قیامت کی آمد کا علم صرف اللہ ہی کو ہے' وہی جب چاہے گا اس کے وقت کو آشکار کرے گا۔اور چونکہ

یہاں بات نفع کے حصول کی ہو رہی تھی اس لیے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سارا خیر تو میں خود ہی اکٹھا کر لیتا۔ اور اب آیئے سورۂ یونس کی آیت کی طرف جہاں نقصان کا ذکر پہلے کیا گیا ہے تو ملاحظہ ہو کہ ایک آیت قبل مشرکین کا یہ مطالبہ نقل ہوا ہے: ﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾ (آیت ۴۸) ''اور وہ کہتے ہیں کہ (عذاب کا یہ) وعدہ کب پورا ہو رہا ہے؟'' چنانچہ وہ عذابِ الٰہی کا ایک طرح مذاق اڑا رہے تھے اور اسے جھٹلا بھی رہے تھے اور وہ یہ نہ جانتے تھے کہ جس وعدے کے پورا ہونے کی وہ جلدی کر رہے ہیں اس میں کیا کچھ نقصان اور مضرت پوشیدہ ہے۔ اب جب کہ ان کے اپنے مطالبے میں نقصان کا ذکر پہلے تھا تو بالکل مناسب تھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نقصان ہی کی پہلے نفی کرتے۔ اور پھر انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ عذابِ الٰہی کے لانے میں جلدی کیوں کرتے ہو؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہر اُمّت کے وعدہ وعید پورا ہونے کا ایک مقرّرہ وقت ہے اور جب وہ وقت آجائے گا تو اس میں ایک ساعت کی کمی بیشی نہ ہوگی۔ اور یوں واضح ہو گیا کہ ہر دو آیت کے اختتامی کلمات بالکل مناسب جگہ پر آئے ہیں۔

(۱۴۹) آیت ۲۰۰

﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۰۰﴾

''اور اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی چھیڑ لاحق ہو تو پھر اللہ سے پناہ مانگو' بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

اور سورۃ حٰم السجدۃ کی آیت ۳۶ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۶﴾

''اور اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی چھیڑ لاحق ہو تو پھر اللہ سے پناہ مانگو' بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

یہاں پہلی آیت میں سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ کی صفات بطور نکرہ وارد ہوئی ہیں اور دوسری آیت میں بطور معرفہ آئی ہیں اور ساتھ ضمیر منفصل (هُوَ) کا بھی اضافہ ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ملاحظہ ہو کہ سورۃ الاعراف کی مذکورہ آیت سے قبل مشرکین کے ان دیوتاؤں کا ذکر ہے جو پتھر اور لکڑی سے بنائے گئے تھے کہ جن کی طرف سورۃ الصافات میں ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے: ﴿اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝۹۵﴾ ''کیا تم ان کو پوجتے ہو جن کو تم خود تراشتے ہو؟'' اور پھر سورۃ الاعراف کی ان آیات میں اس بات کی نفی کی گئی کہ نہ وہ کوئی چیز پیدا کر سکتے ہیں اور نہ مدد کر سکتے ہیں۔

﴿اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝۱۹۱﴾

''کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کچھ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں بلکہ وہ تو خود پیدا کیے گئے ہیں۔''

﴿وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَاۤ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝۱۹۲﴾

''اور نہ تو وہ ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کر سکتے ہیں۔''

اور اگلی ایک آیت میں اس بات کی بھی نفی کی گئی کہ ان میں سننے اور دیکھنے کی بھی طاقت نہیں ہے:

﴿وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا

يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

''اور اگر تم انہیں ہدایت کی دعوت دو تو وہ نہ سنیں گے۔ اور آپ سمجھتے ہیں کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں لیکن وہ کچھ دیکھ نہیں رہے ہوتے۔''

اور اس سے قبل آیت ۱۹۵ میں اس بات کی نفی کی گئی کہ ان کے پاس پکڑ دھکڑ کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

﴿اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ﴾

''کیا اُن کے پاس پاؤں ہیں کہ جن سے وہ چلتے ہوں؟ یا کیا اُن کے پاس ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہوں؟''

اب ان آیات میں مشرکین کا کوئی ایسا دعویٰ نقل نہیں کیا گیا کہ اُن کے دیوتا ایسی کوئی بھی صفت رکھتے ہیں کہ ان کا شمار زندہ شخصیتوں میں کیا جائے' یا ان کے پاس کوئی ایسی صلاحیت پائی جاتی ہے جو صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے' اس لیے مناسب تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دونوں صفات ''سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ'' کا بغیر کسی تاکید کے ذکر کر دیا جائے' کہ جس سے غیر اللہ میں ان دو صفات کے پائے جانے کی بآسانی نفی ہو جاتی ہے۔

اس کے مقابلے میں سورۃ حم السجدۃ کی مذکورہ آیت سے قبل مشرکین کے ایسے دعاوی کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو ان صفات کا حامل سمجھتے ہیں' بلکہ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو جِن اور اِنس کو اپنی گمراہی کا سبب گردانتے ہیں۔ یہ آیتیں ملاحظہ ہوں:

﴿وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾

''لیکن تم نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نہیں جانتا بہت سی اُن چیزوں کو جو تم کرتے رہے ہو۔''

﴿وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ (آیت ۲۵)

''اور ہم نے ان کے لیے ایسے ساتھی مہیّا کر رکھے تھے جو ان کے اگلے پچھلے اعمال ان کے لیے خوبصورت بنا کر پیش کر دیتے تھے۔''

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (آیت ۲۹)

''اور کافروں نے کہا: اے ربّ! ہمیں جِن اور انس میں سے وہ لوگ دکھا دے جو ہمیں گمراہ کرتے رہے تھے۔''

ان آیات سے ظاہر ہو گیا کہ انہیں گمراہ کرنے والے انسانوں اور جِنّوں میں سے تھے جو کہ سمع و بصر کی صفات رکھتے تھے' علم سے بھی نسبت رکھتے تھے۔ سورۃ الاعراف میں یہ مضمون نہ تھا' اس لیے یہاں ان کی تردید کے لیے اللہ تعالیٰ کے لیے نہ صرف ''السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ'' کہا گیا بلکہ اس سے قبل ''هُوَ'' کی ضمیر منفصل بھی لائی گئی' اور عربی اسلوب کے لحاظ سے جہاں کسی کے دعویٰ کی نفی کی جا رہی ہو تو وہاں مؤکد جملہ لایا جاتا ہے۔ تو واضح ہو گیا کہ ہر دو سورت میں ذکر کی گئی صفات چاہے نکرہ ہوں یا معرفہ اپنی اپنی جگہ مناسبت رکھتی ہیں' اور اگر اس کا الٹ کیا جاتا تو قطعاً غیر مناسب ہوتا۔ واللہ اعلم!

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سُورۃ یُونس

آیات ۶۱ تا ۷۰

﴿وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا
عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي
الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾ اَلَآ اِنَّ
اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾
لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِيْ
جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ
اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا
مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾﴾

ش ء ن

شَأَنَ يَشْأَنُ (ف) شَأْنًا: قدر ومنزلت والا کام کرنا' اپنی فطرت کے مطابق کام کرنا۔

شَاْنٌ (اسم ذات بھی ہے) : کام' مصروفیت ۔ زیر مطالعہ آیت ۶۱ ۔

ع ز ب

عَزَبَ یَعْزُبُ (ن) عَزْبًا : پوشیدہ ہونا' غائب ہونا ۔ زیر مطالعہ آیت ۶۱ ۔

ترکیب

(آیت ۶۱) مَا تَكُوْنُ اور مَا تَتْلُوْا کے مَا کو نافیہ ماننا بہتر ہے' کیونکہ آگے لَا تَعْمَلُوْنَ بھی آیا ہے اور اس کے آگے اِلَّا بھی آیا ہے ۔ ذَرَّةٍ پر عطف ہونے کی وجہ سے اَصْغَرَ اور اَكْبَرَ حالتِ جر میں ہیں ۔ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ قائم مقام خبر ہے ۔ اس کا مبتدا اور خبر دونوں محذوف ہیں ۔ (آیت ۶۶) وَمَا یَتَّبِعُ کا مَا موصولہ ہے ۔ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اس کا صلہ ہے ۔

ترجمہ:

وَمَا تَكُوْنُ : اور آپؐ نہیں ہوتے	فِیْ شَاْنٍ : کسی کام میں
وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ : اور آپؐ نہیں پڑھتے اس سے	مِنْ قُرْاٰنٍ : کچھ قرآن میں سے
وَّلَا تَعْمَلُوْنَ : اور تم لوگ عمل نہیں کرتے	مِنْ عَمَلٍ : کوئی بھی عمل
اِلَّا كُنَّا : مگر (یہ کہ) ہم ہوتے ہیں	عَلَیْكُمْ : تم لوگوں پر
شُهُوْدًا : موجود	اِذْ تُفِیْضُوْنَ : جب تم لوگ پھیلاتے ہو (یعنی تبلیغ کرتے ہو)
فِیْهِ : اس میں	وَمَا یَعْزُبُ : اور پوشیدہ نہیں ہو پاتی
عَنْ رَّبِّكَ : آپؐ کے رب سے	مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ : کسی بھی ذرہ کے ہم وزن (کوئی چیز)
فِی الْاَرْضِ : زمین میں	وَلَا فِی السَّمَآءِ : اور نہ ہی آسمان میں
وَلَآ اَصْغَرَ : اور نہ ہی زیادہ چھوٹی	مِنْ ذٰلِكَ : اس سے
وَلَآ اَكْبَرَ : اور نہ ہی زیادہ بڑی	اِلَّا : مگر (یہ کہ)
فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ : (سب کچھ) ایک واضح کتاب میں ہے	اَلَآ اِنَّ : سن لو یقیناً
اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ : اللہ کے دوست (وہ ہیں)	لَا خَوْفٌ : کوئی خوف نہیں ہے
عَلَیْهِمْ : جن پر	وَلَا هُمْ : اور نہ ہی وہ لوگ
یَحْزَنُوْنَ : پچھتاتے ہیں	اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا : وہ لوگ جو ایمان لائے
وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ : اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں	لَهُمُ الْبُشْرٰی : ان کے لیے بشارت ہے
فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا : دُنیوی زندگی میں	وَفِی الْاٰخِرَةِ : اور آخرت میں

لَا تَبۡدِيۡلَ : کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہے
ذٰلِكَ : یہ
وَلَا يَحۡزُنۡكَ : اور چاہیے کہ افسردہ مت کرے آپؐ کو
اِنَّ الۡعِزَّةَ : یقیناً کُل عزّت
جَمِيۡعًا : سب کی سب
الۡعَلِيۡمُ : جاننے والا ہے
لِلّٰهِ : اللہ ہی کا ہے
وَمَنۡ فِي الۡاَرۡضِ : اور وہ جو زمین میں ہے
الَّذِيۡنَ : وہ لوگ جو
مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ
اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ : وہ پیروی نہیں کرتے
وَاِنۡ هُمۡ : اور وہ نہیں ہیں
هُوَ الَّذِىۡ : وہی ہے جس نے
لَكُمُ : تم لوگوں کے لیے
لِتَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ : تاکہ تم سکون حاصل کرو اس میں
مُبۡصِرًا : بینا کرنے والا ہوتے ہوئے
لَاٰيٰتٍ : لازماً نشانیاں ہیں
يَّسۡمَعُوۡنَ : جو سن کر سمجھتے ہیں
اتَّخَذَ اللّٰهُ : بنایا اللہ نے
سُبۡحٰنَهٗ : (حالانکہ) اُس کی پاکیزگی ہے (ہر ضرورت سے)
لَهٗ : اُسی کا ہے
وَمَا فِي الۡاَرۡضِ : اور وہ جو زمین میں ہے
مِّنۡ سُلۡطٰنٍ : کوئی بھی دلیل
اَتَقُوۡلُوۡنَ : کیا تم لوگ کہتے ہو

لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ : اللہ کے فرمانوں میں
هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ : ہی عظیم کامیابی ہے
قَوۡلُهُمۡ : ان کی بات
لِلّٰهِ : اللہ ہی کی (دی ہوئی) ہے
هُوَ السَّمِيۡعُ : وہی سننے والا ہے
اَلَاۤ اِنَّ : سن لو یقیناً
مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ : وہ جو آسمانوں میں ہے
وَمَا يَتَّبِعُ : اور کس کی پیروی کرتے ہیں
يَدۡعُوۡنَ : پکارتے ہیں
شُرَكَآءَ : شریکوں کو
اِلَّا الظَّنَّ : مگر گمان کی
اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ : سوائے اس کے کہ اٹکل لگاتے ہیں
جَعَلَ : بنایا
الَّيۡلَ : رات کو
وَالنَّهَارَ : اور دن کو
اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ : یقیناً اس میں
لِّقَوۡمٍ : ایسے لوگوں کے لیے
قَالُوۡا : انہوں نے کہا
وَلَدًا : ایک بیٹا
هُوَ الۡغَنِىُّ : وہ بے نیاز ہے

مَا فِي السَّمٰوٰتِ : وہ جو آسمانوں میں ہے
اِنۡ عِنۡدَكُمۡ : نہیں ہے تمہارے پاس
بِهٰذَا : اس کے لیے
عَلَى اللّٰهِ : اللہ پر

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ : وہ جو تم نہیں جانتے ہو
اِنَّ الَّذِیْنَ : بے شک وہ لوگ جو
عَلَی اللّٰہِ : اللہ پر
لَا یُفْلِحُوْنَ : وہ مراد نہیں پاتے
فِی الدُّنْیَا : دنیا میں
مَرْجِعُھُمْ : ان کا لوٹنا ہے
الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ : سخت عذاب
کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ : یہ لوگ کفر کرتے ہیں

قُلْ : آپؐ کہیے
یَفْتَرُوْنَ : گھڑتے ہیں
الْکَذِبَ : جھوٹ
مَتَاعٌ : برتنے کا سامان ہے
ثُمَّ اِلَیْنَا : پھر ہماری طرف ہی
ثُمَّ نُذِیْقُھُمْ : پھر ہم چکھائیں گے ان کو
بِمَا : بسبب اس کے جو

نوٹ: زیر مطالعہ آیات ۶۲ تا ۶۴ میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کے متعلق کچھ باتیں ہمیں بتائی ہیں۔ ان کو سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ ولی اللہ لوگوں کے متعلق جو عام تصوّر ہے وہ درست نہیں ہے۔ ''عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف و کرامات یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے' یہ غلط اور دھوکہ ہے۔ ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف اور غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔'' (معارف القرآن' بحوالہ تفسیر مظہری)۔ ان غلط تصوّرات سے ذہن کو صاف کر کے جب ہم مذکورہ آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ولی اللہ کی حقیقت واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔

مذکورہ آیات سے ایک تو یہ بات قطعی طور پر معلوم ہوئی کہ یقیناً ایک ایسے مرتبہ اور مقام کا وجود ہے جسے ہم لوگ ولی اللہ کہتے ہیں اور جس کے لیے آیت میں اللہ تعالیٰ نے جمع کے صیغے میں ''اولیاء اللہ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس لیے ہم لوگوں کا ولی اللہ کا تصوّر کوئی دیومالائی تصوّر نہیں ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ولی اللہ کی پہچان کیا ہے؟ پہچان یہ ہے کہ اولیاء اللہ خوف اور حزن (پچھتاوے) سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اب پہلے ان صفات کی نوعیت اور اہمیت کو سمجھ لیں' پھر ہم دیکھیں گے کہ انہیں حاصل کرنے کا طریقہ کیا بتایا گیا ہے۔

خوف درحقیقت ایک داخلی کیفیت ہے اور اس کا تعلق مستقبل کے اندیشوں سے ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے' کہیں ویسا نہ ہو جائے' پتہ نہیں کیا ہونا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ کوئی بظاہر کتنا بھی پُرسکون اور خوش و خرم نظر آئے لیکن اگر اندر ہی اندر وہ اس قسم کے اندیشوں میں مبتلا رہتا ہو تو وہ خوف سے محفوظ نہیں ہے۔ اس کیفیت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان اضطراب (anxiety) اور اعصابی تناؤ (tension) کا شکار رہتا ہے۔ ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اسی طرح حزن یعنی پچھتاوا بھی ایک داخلی کیفیت ہے اور اس کا تعلق ماضی سے ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا' کاش میں ایسا نہ کرتا' وغیرہ وغیرہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ لفظ ''لَوْ'' (کاش) شیطان کے عمل کا دروازہ کھولتا ہے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آئی ہے کہ پچھتاوے جب ہماری سوچ پر غالب آجاتے ہیں تو ہم قنوطیت (frustration) کا شکار ہو جاتے ہیں جو کہ گناہ ہے (الحجر:۵۶)۔ اس دور کے ماہرینِ نفسیات متفق

ہیں کہ قنوطیت انسان کی قوتِ کار کو سلب کر کے اسے ناکارہ بنا دیتی ہے اور اس کی شخصیت کی کشش اور جاذبیت کو ختم کر کے لوگوں کو اس سے دور کر دیتی ہے۔ چنانچہ ولی اللہ کی پہچان کی دوسری صفت یہ ہے کہ یہ لوگ پچھتاتے نہیں ہیں۔

اس کے آگے پھر ان دونوں صفات کو حاصل کرنے والے راستے کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پھر تقویٰ اختیار کرتے رہے۔ نوٹ کریں کہ تقویٰ کے لیے یہاں ماضی استمراری کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ولی اللہ کے مقام تک رسائی کے لیے صرف تقویٰ نہیں بلکہ تقویٰ پر تسلسل درکار ہے۔ کیونکہ جو چیز غلام کو آقا کا دوست بناتی ہے وہ آقا کی خوشنودی کے تجسّس یعنی تقویٰ کا دوام ہے۔ چنانچہ جو لوگ تقویٰ کو اپنا طرزِ زندگی (life style) بنا لیتے ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہے' اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ان بشارتوں کی ابتدا تو وہی ہے جس کا ذکر آ چکا ہے' یعنی خوف اور حزن سے نجات۔ اس کے بعد پھر اس دنیا میں بشارتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو آخرت کی منزلوں یعنی قبر اور حشر وغیرہ میں جاری رہتا ہے' یہاں تک کہ انسان اپنے گھر یعنی جنّت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی نوٹ کر لیں کہ کامیابی کے latest اور most modern معیار خواہ کچھ بھی ہوں' اللہ تعالیٰ کے نزدیک شاندار کامیابی یہی ہے کہ انسان اس مقام و مرتبہ کو پا لے۔

اس مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ولی اللہ کا مرتبہ و مقام فرداً فرداً ہر ایک مسلمان کی دسترس میں ہے۔ اس کے لیے نہ تو عالم فاضل ہونا ضروری ہے اور نہ تارک الدنیا ہونا یا کسی خانقاہ میں بیٹھنا ضروری ہے' کیونکہ اس منزل تک پہنچانے والا راستہ تقویٰ کا دوام ہے' اور تقویٰ کا صحیح ٹیسٹ بھرپور زندگی کے منجھدار میں ہوتا ہے۔ اس لیے عام زندگی بسر کرنے والا جو مسلمان بھی چاہے وہ کوشش کر کے ولی اللہ کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اگر کسی کو منزل نہ بھی ملے تب بھی اس راہ کا راہی تو بن ہی سکتا ہے اور یہ بھی بڑی بات ہے۔

آیات ۷۱ تا ۸۲

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ

بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٦﴾ قَالَ
مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿٧٧﴾ قَالُوْٓا
اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ
وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٨﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِىْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿٧٩﴾ فَلَمَّا
جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿٨٠﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى
مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨١﴾
وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨٢﴾

ل ف ت

لَفَتَ يَلْفِتُ (ض) لَفْتًا : کسی کو کسی چیز سے پھیر دینا۔ زیر مطالعہ آیت ۷۸۔

اِلْتَفَتَ (افتعال) اِلْتِفَاتًا : اہتمام سے اپنی توجّہ کسی طرف پھیرنا' مڑ کر دیکھنا۔ ﴿وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ﴾ (ھود:۸۱) ''اور چاہیے کہ مڑ کر نہ دیکھے تم میں سے کوئی ایک بھی۔''

ترکیب

(آیت ۷۷) اَتَقُوْلُوْنَ کے بعد هٰذَا محذوف ہے جو کہ گزشتہ آیت میں لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے آگے سِحْرٌ خبر مقدّم اور هٰذَا مبتدأ مؤخر ہے۔ (آیت ۷۸) لِتَلْفِتَنَا کے لام کَیْ پر عطف ہونے کی وجہ سے تَكُوْنَ حالت نصب میں آیا ہے اور یہ واحد مؤنث کا صیغہ ہے' اس کا فاعل اَلْكِبْرِيَآءُ ہے جو مؤنث ہے۔ (آیت ۸۱) اَلسِّحْرُ سے پہلے فَهُوَ محذوف ہے۔

ترجمہ:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ: اور آپؐ پڑھ کر سنائیں ان لوگوں کو
اِذْ قَالَ : جب انہوںؑ نے کہا
يٰقَوْمِ : اے میری قوم
كَبُرَ : بھاری
مَّقَامِىْ : میرا کھڑا ہونا
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ : اللہ کی آیات سے
تَوَكَّلْتُ : میں نے (تو) بھروسہ کیا
اَمْرَكُمْ : اپنے مشورہ کو
ثُمَّ لَا يَكُنْ : پھر چاہیے کہ نہ ہو
نَبَاَ نُوْحٍ : نوحؑ کی خبر
لِقَوْمِهٖ : اپنی قوم سے
اِنْ كَانَ : اگر ہے
عَلَيْكُمْ : تم پر
وَتَذْكِيْرِىْ : اور میرا نصیحت کرنا
فَعَلَى اللّٰهِ : تو اللہ پر ہی
فَاَجْمِعُوْٓا : پھر تم لوگ جمع کرو
وَشُرَكَآءَكُمْ : اور اپنے شریکوں کو
اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ : تمہارا مشورہ تم لوگوں پر

غُمَّةً : کسی مبہم حال میں
اِلَیَّ : میری طرف (یعنی میرے متعلق)
فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ : پھر اگر تم منہ موڑتے ہو
مِّنْ اَجْرٍ : کسی قسم کا کوئی اجر
اِلَّا عَلَی اللّٰہِ : مگر اللہ پر
اَنْ اَکُوْنَ : کہ میں ہو جاؤں

فَکَذَّبُوْہُ : تو انہوں نے جھٹلایا انؑ کو
وَمَنْ مَّعَہٗ : اور ان لوگوں کو جو اُن کے ساتھ تھے
وَجَعَلْنٰھُمْ : اور ہم نے بنایا ان لوگوں کو
وَاَغْرَقْنَا : اور ہم نے غرق کیا
کَذَّبُوْا : جھٹلایا
فَانْظُرْ : تو آپؐ دیکھیں
عَاقِبَۃُ الْمُنْذَرِیْنَ : خبردار کیے جانے والوں کا انجام

مِنْۢ بَعْدِہٖ : ان کے بعد
اِلٰی قَوْمِھِمْ : ان لوگوں کی قوم کی طرف
بِالْبَیِّنٰتِ : واضح (نشانیوں) کے ساتھ
لِیُؤْمِنُوْا : کہ ایمان لاتے
مِنْ قَبْلُ : پہلے سے
عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ : حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر

مِنْۢ بَعْدِھِمْ : ان کے بعد
اِلٰی فِرْعَوْنَ : فرعون کی طرف
بِاٰیٰتِنَا : اپنی نشانیوں کے ساتھ
وَکَانُوْا : اور وہ تھے

ثُمَّ اقْضُوْٓا : پھر تم فیصلہ کرو
وَلَا تُنْظِرُوْنِ : اور تم مہلت مت دو مجھ کو
فَمَا سَاَلْتُکُمْ : تو میں نہیں مانگتا تم سے
اِنْ اَجْرِیَ : نہیں ہے میرا اجر
وَاُمِرْتُ : اور مجھے حکم دیا گیا
مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ : فرمانبرداری کرنے والوں میں سے

فَنَجَّیْنٰہُ : پس ہم نے نجات دی ان کو
فِی الْفُلْکِ : کشتی میں
خَلٰٓئِفَ : جانشین
الَّذِیْنَ : ان کو جنہوں نے
بِاٰیٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو
کَیْفَ کَانَ : کیسا تھا
ثُمَّ بَعَثْنَا : پھر ہم نے بھیجے کا انجام

رُسُلًا : کچھ رسول
فَجَآءُوْھُمْ : تو وہ آئے ان کے پاس
فَمَا کَانُوْا : تو نہیں تھے وہ
بِمَا کَذَّبُوْا بِہٖ : بسبب اس کے انہوں نے جھٹلایا جس کو
کَذٰلِکَ نَطْبَعُ : اس طرح ہم چھاپ لگاتے ہیں
ثُمَّ بَعَثْنَا : پھر ہم نے بھیجا

مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ : موسیٰؑ اور ہارونؑ کو
وَمَلَا۟ئِہٖ : اور اس کے سرداروں (کی طرف)
فَاسْتَکْبَرُوْا : تو وہ بڑے بننے لگے
قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ : جرم کرنے والے لوگ

فَلَمَّا : پھر جب
مِنْ عِنْدِنَا : ہمارے پاس سے
اِنَّ هٰذَا : بے شک یہ
قَالَ مُوْسٰی : کہا موسیٰ نے
لِلْحَقِّ : حق کے لیے
جَآءَكُمْ : وہ آیا تمہارے پاس
هٰذَا : یہ
السّٰحِرُوْنَ : جادو کرنے والے
اَجِئْتَنَا : کیا تو آیا ہمارے پاس
عَمَّا : اس سے
اٰبَآءَنَا : اپنے آباء واَجداد کو
لَكُمَا : تم دونوں کے لیے
فِي الْاَرْضِ : زمین میں
لَكُمَا : تم دونوں پر
وَقَالَ فِرْعَوْنُ : اور کہا فرعون نے
بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ : ہر ایک جاننے والے جادوگر کو
جَآءَ السَّحَرَةُ : آئے جادوگر
مُوْسٰی : موسیٰؑ نے
مَآ اَنْتُمْ : اس کو جو تم لوگ
فَلَمَّآ اَلْقَوْا : پھر جب انہوں نے ڈالا
مَا جِئْتُمْ بِهِ : تم لائے ہو جس کو
اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ
اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ
عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ : نظم بگاڑنے والوں کے عمل کو
الْحَقَّ : حق کو
وَلَوْ كَرِهَ : اور اگرچہ کراہت کریں

جَآءَهُمُ الْحَقُّ : آیا ان کے پاس حق
قَالُوْٓا : تو انہوں نے کہا
لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ : یقیناً کھلا جادو ہے
اَتَقُوْلُوْنَ : کیا تم لوگ کہتے ہو (یہ)
لَمَّا : جب
اَسِحْرٌ : کیا جادو ہے
وَلَا يُفْلِحُ : اور مراد نہیں پاتے
قَالُوْٓا : انہوں نے کہا
لِتَلْفِتَنَا : تاکہ تو پھیر دے ہم کو
وَجَدْنَا عَلَيْهِ : ہم نے پایا جس پر
وَتَكُوْنَ : اور تاکہ ہو جائے
الْكِبْرِيَآءُ : بڑائی
وَمَا نَحْنُ : اور ہم نہیں ہیں
بِمُؤْمِنِيْنَ : ایمان لانے والے
ائْتُوْنِيْ : لاؤ میرے پاس
فَلَمَّا : پس جب
قَالَ لَهُمْ : تو کہا ان سے
اَلْقُوْا : تم لوگ ڈالو
مُّلْقُوْنَ : ڈالنے والے ہو
قَالَ مُوْسٰی : تو کہا موسیٰؑ نے
السِّحْرُ : (وہ تو) جادو ہے
سَيُبْطِلُهٗ : باطل کرے گا (ناکارہ کرے گا) اس کو
لَا يُصْلِحُ : اصلاح نہیں کرتا
وَيُحِقُّ اللّٰهُ : اور حق کرتا ہے اللہ
بِكَلِمٰتِهٖ : اپنے فرمانوں سے
الْمُجْرِمُوْنَ : جرم کرنے والے

آیات ۸۳ تا ۹۲

﴿فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ
يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَقَالَ
مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾
فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا
بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا
بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالَ
مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا
لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا
حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ
سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ
وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ
اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ
مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ
كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾﴾

ب د ن

بَدَنَ يَبْدُنُ (ن) بَدَنًا : موٹے یا فربہ جسم والا ہونا۔

بَدَنٌ (اسم ذات بھی ہے) : جسم۔ زیر مطالعہ آیت ۹۲۔

بَدَنَةٌ ج بُدْنٌ : قربانی کے فربہ جانور جو مکہ میں ذبح کیے جائیں۔ ﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ (الحج:۳۶) ''اور قربانی کے فربہ جانور، ہم نے بنایا ان کو تمہارے لیے اللہ کے شعائر میں سے۔''

ترجمہ:

فَمَآ اٰمَنَ : پس بات نہیں مانی

اِلَّا ذُرِّيَّةٌ : مگر کچھ اولاد (یعنی نوجوانوں) نے

عَلٰى خَوْفٍ : ایسے خوف کے باوجود

وَمَلَا۟ئِهِمْ : اور ان کے سرداروں سے

وَاِنَّ فِرْعَوْنَ : اور بے شک فرعون

لِمُوْسٰى : موسیٰؑ کی

مِّنْ قَوْمِهٖ : ان کی قوم میں سے

مِّنْ فِرْعَوْنَ : فرعون سے

اَنْ يَّفْتِنَهُمْ : کہ وہ آزمائش میں ڈالیں ان کو

لَعَالٍ : یقیناً سرکشی کرنے والا ہے

فِي الْاَرْضِ :زمین میں
لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ :یقیناً حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے ہے
يٰقَوْمِ :اے میری قوم
بِاللّٰهِ :اللہ پر
اِنْ كُنْتُمْ :اگر تم ہو
فَقَالُوْا :تو انہوں نے کہا
تَوَكَّلْنَا :ہم نے بھروسہ کیا
لَا تَجْعَلْنَا :تو نہ بنانا ہم کو
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ :ظلم کرنے والے لوگوں کے لیے
بِرَحْمَتِكَ :اپنی رحمت سے
وَاَوْحَيْنَآ :اور ہم نے وحی کی
وَاَخِيْهِ :اور ان کے بھائی کی طرف
لِقَوْمِكُمَا :اپنی قوم کے لیے
بُيُوْتًا :کچھ گھروں کو
بُيُوْتَكُمْ :اپنے گھروں کو
وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ :اور قائم کرو نماز کو
الْمُؤْمِنِيْنَ :ایمان لانے والوں کو
رَبَّنَآ :اے ہمارے رب!
فِرْعَوْنَ :فرعون کو
زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا :زینت اور مال
رَبَّنَا :اے ہمارے رب
عَنْ سَبِيْلِكَ :تیری راہ سے
عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ :ان کے مالوں کو

وَاِنَّهٗ :اور بے شک وہ
وَقَالَ مُوْسٰى :اور کہا موسیٰؑ نے
اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ :اگر تم لوگ ایمان رکھتے ہو
فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا :تو اس پر ہی بھروسہ رکھو
مُّسْلِمِيْنَ :فرمانبرداری کرنے والے
عَلَى اللّٰهِ :اللہ پر ہی
رَبَّنَا :اے ہمارے ربّ
فِتْنَةً :آزمائش
وَنَجِّنَا :اور تُو نجات دے ہم کو
مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ :کفر کرنے والے لوگوں سے
اِلٰى مُوْسٰى :موسیٰ کی طرف
اَنْ تَبَوَّاٰ :کہ تم دونوں ٹھکانہ بناؤ
بِمِصْرَ :مصر میں
وَّاجْعَلُوْا :اور تم بناؤ
قِبْلَةً :قبلہ (رخ)
وَبَشِّرِ :اور آپؐ بشارت دیجئے
وَقَالَ مُوْسٰى :اور کہا موسیٰؑ نے
اِنَّكَ اٰتَيْتَ :بے شک تو نے دیا
وَمَلَاَهٗ :اور اس کے سرداروں کو
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا :دنیوی زندگی میں
لِيُضِلُّوْا :تاکہ وہ گمراہ کریں (لوگوں کو)
رَبَّنَا اطْمِسْ :اے ہمارے رب! تو تہس نہس کر دے
وَاشْدُدْ :اور تو سخت کر دے

عَلٰی قُلُوْبِهِمْ : ان کے دلوں کو
حَتّٰی یَرَوُا : یہاں تک کہ وہ دیکھیں
قَالَ : کہا (اللہ نے)
دَّعْوَتُكُمَا : تم دونوں کی دعا
وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ : اور تم دونوں ہرگز پیروی مت کرنا
لَا یَعْلَمُوْنَ : علم نہیں رکھتے
بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ : بنی اسرائیل کو
فَاَتْبَعَهُمْ : تو پیچھے لگا ان کے
بَغْیًا : سرکشی کرتے ہوئے
حَتّٰٓی اِذَآ : یہاں تک کہ جب
قَالَ اٰمَنْتُ : تو اس نے کہا میں ایمان لایا
اِلَّا الَّذِیْٓ : سوائے اس کے
بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ : بنی اسرائیل
مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ : فرمانبرداری کرنے والوں میں سے
وَقَدْ عَصَیْتَ : اور تو نافرمانی کر چکا ہے
وَ كُنْتَ : اور تو تھا
فَالْیَوْمَ : پس آج
بِبَدَنِكَ : تیرے بدن کے ساتھ
لِمَنْ : ان کے لیے جو
اٰیَةً : ایک نشانی
عَنْ اٰیٰتِنَا : ہماری نشانیوں سے

فَلَا یُؤْمِنُوْا : نتیجتاً وہ لوگ ایمان نہ لائیں
الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ : دردناک عذاب کو
قَدْ اُجِیْبَتْ : قبول کی گئی ہے
فَاسْتَقِیْمَا : پس ڈٹے رہو
سَبِیْلَ الَّذِیْنَ : ان کے راستے کی جو
وَجٰوَزْنَا : اور ہم نے پار کیا
الْبَحْرَ : سمندر کے
فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ : فرعون اور اس کا لشکر
وَّعَدْوًا : اور دشمنی کرتے ہوئے
اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ : آلگا اس کو ڈوبنا
اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ : اس کا کہ کوئی بھی الٰہ نہیں ہے
اٰمَنَتْ بِهٖ : ایمان لائے جس پر
وَاَنَا : اور میں ہوں
آٰلْئٰنَ : کیا اب؟

قَبْلُ : پہلے
مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ : نظم بگاڑنے والوں میں سے
نُنَجِّیْكَ : بچا رکھیں گے تجھ کو
لِتَكُوْنَ : تا کہ تو ہو جائے
خَلْفَكَ : تیرے پیچھے (آنے والے) ہیں
وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ : اور بے شک لوگوں میں سے اکثر
لَغٰفِلُوْنَ : غفلت برتنے والے ہیں

نوٹ ۱ : آیت ۸۷ میں ایک خاص حکم کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل نمازیں صرف اپنی عبادت گاہوں میں ادا کرتے تھے اور پچھلی امتوں کے لیے بھی یہی حکم تھا' کیونکہ ان کی نماز گھروں میں ادا نہیں ہوتی تھی۔ یہ خصوصی سہولت اُمّتِ محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو عطا ہوئی کہ ہر جگہ جہاں چاہیں نماز ادا کریں۔ فرعون نے بنی اسرائیل کی تمام عبادت گاہوں کو مسمار کر دیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے لیے مصر میں نئے

مکانات بنائے جائیں اوران کا رخ قبلہ کی طرف ہو تا کہ وہ ان ہی مکانات میں نماز ادا کر سکیں۔اس وقت خصوصی حالات کے تحت عارضی اجازت دی گئی تھی کہ گھروں ہی میں نماز ادا کرلیا کریں۔دوسری رائے یہ ہے کہ اس ضرورت کے وقت بھی ان کو مخصوص گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی' عام گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت اس وقت بھی نہیں تھی۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اوران کے اصحاب کا قبلہ خانہ کعبہ تھا۔

اس آیت کے شروع میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو تثنیہ کے صیغے میں خطاب کیا گیا' کیونکہ مکانات میں نماز کی اجازت دینا ان ہی کا کام تھا۔اس کے بعد اقامتِ صلوٰۃ کا حکم جمع کے صیغے میں دیا گیا' کیونکہ اس حکم میں پیغمبر اور امت' سب شامل ہیں۔اس کے بعد بشارت دینے کا حکم واحد کے صیغے میں صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا' کیوں کہ اصل صاحبِ شریعت نبی آپؑ ہی تھے۔(معارف القرآن)

نوٹ ۲: آیت ۸۹ میں ان کی دعا کی قبولیت کی اطلاع دونوں پیغمبروں کو دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ اپنے فرضِ منصبی یعنی دعوت وتبلیغ میں لگے رہیں اور قبولیت دعا کا اثر دیر میں ظاہر ہو تو جلد بازی نہ کریں۔پھر ان کی دعا کی قبولیت کا اثر چالیس سال بعد ظاہر ہوا۔(معارف القرآن)

آیات ۹۳ تا ۱۰۳

﴿وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا
حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ
یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۹۴﴾
وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ
حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰی یَرَوُا
الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِیْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ ؕ
لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ ﴿۹۸﴾
وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی
یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ
عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِی
الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا
مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾﴾

ترکیب

(آیت ۹۳) مُبَوَّاَ صِدْقٍ میں مُبَوَّاَ دراصل اسم المفعول مُبَوَّأٌ ہے جو ظرف کے معنی میں آیا ہے' اس لیے حالتِ نصب میں ہے اور مضاف ہونے کی وجہ سے تنوین ختم ہوئی ہے۔ (آیت ۹۵) فَتَكُوْنَ کا فَا سببیہ ہے۔ (آیت ۹۷) حَتّٰى کا تعلق گزشتہ آیت کے لَا يُؤْمِنُوْنَ سے ہے۔ (آیت ۹۸) فَنَفَعَهَا اِيْمَانُهَا میں هَا کی ضمیریں قَرْيَةً کے لیے ہیں۔ لفظی رعایت سے یہ ضمیریں واحد مؤنث آئی ہیں جبکہ یہاں قَرْيَةٌ سے مراد اہلِ قریہ ہیں' اس لیے یہاں هَا سے مراد هُمْ ہے' جس کو ترجمہ میں ظاہر کیا جائے گا۔ (آیت ۱۰۰) تُؤْمِنَ واحد مؤنث کا صیغہ ہے' اس کی ضمیر فاعلی هِيَ' نَفْسٍ کے لیے ہے۔ (آیت ۱۰۱) اَلنُّذُرُ جمع مکسر ہے نَذِيْرٌ کا۔ (آیت ۱۰۳) نُنْجِ دراصل مضارع میں جمع متکلّم کا صیغہ نُنْجِيْ ہے' ی حرفِ علّت ہے جو لفظ میں آخری ہونے کی وجہ سے ساکن ہوئی۔ پھر الْمُؤْمِنِيْنَ میں لام بھی ساکن ہے۔ دو ساکن جمع ہوئے' اس لیے ی گر گئی ہے۔

ترجمہ:

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا : اور ہم ٹھکانہ دے چکے ہیں
مُبَوَّاَ صِدْقٍ : ایک سچائی کا ٹھکانہ
مِّنَ الطَّيِّبٰتِ : پاکیزہ (چیزوں) میں سے
حَتّٰى : یہاں تک کہ
اِنَّ رَبَّكَ : یقیناً آپ کا رب
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ : قیامت کے دن
فَاِنْ كُنْتَ : پھر اگر آپؐ ہیں
مِّمَّآ : اس کے بارے میں جس کو
فَسْئَلِ الَّذِيْنَ : تو آپ پوچھیں ان سے جو
مِنْ قَبْلِكَ : آپ سے پہلے سے
مِنْ رَّبِّكَ : آپؐ کے رب (کی طرف) سے
مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ : شک کرنے والوں میں سے
مِنَ الَّذِيْنَ : ان لوگوں میں سے جنہوں نے
فَتَكُوْنَ : ورنہ آپؐ ہو جائیں گے
اِنَّ الَّذِيْنَ : بے شک وہ لوگ
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ : بنی اسرائیل کو
وَّرَزَقْنٰهُمْ : اور ہم نے رزق دیا ان کو
فَمَا اخْتَلَفُوْا : تو انہوں نے اختلاف نہیں کیا
جَآءَهُمُ الْعِلْمُ : آیا ان کے پاس علم
يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ : فیصلہ کرے گا ان کے درمیان
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ : اس میں جس میں وہ اختلاف کرتے تھے
فِيْ شَكٍّ : کسی شک میں
اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ : ہم نے اتارا آپؐ کی طرف
يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ : پڑھتے ہیں کتاب کو
لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ : یقیناً آ چکا ہے آپؐ کے پاس حق
فَلَا تَكُوْنَنَّ : تو آپؐ ہرگز مت ہوں
وَلَا تَكُوْنَنَّ : اور آپؐ ہرگز مت ہوں
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ : جھٹلایا اللہ کی نشانیوں کو
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ : خسارہ اٹھانے والوں میں
حَقَّتْ عَلَيْهِمْ : حق ہوا جن پر

كَلِمَتُ رَبِّكَ : آپؐ کے ربّ کا فرمان
وَلَوْ جَآءَتْهُمْ : اور اگر چہ (یعنی خواہ) آئے ان کے پاس
حَتّٰى يَرَوُا : یہاں تک کہ وہ دیکھیں
فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ : پس کیوں نہ ہوئی کوئی ایسی بستی
فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ : پھر نفع دیتا ان کو ان کا ایمان
لَمَّآ اٰمَنُوْا : جب وہ لوگ ایمان لائے
عَذَابَ الْخِزْيِ : رسوائی کے عذاب کو
وَمَتَّعْنٰهُمْ : اور ہم نے فائدہ پہنچایا ان کو
وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ : اور اگر چاہتا آپؐ کا رب
مَنْ فِي الْاَرْضِ : وہ جو زمین میں ہیں
جَمِيْعًا : سب کے سب
تُكْرِهُ النَّاسَ : زبردستی کریں گے لوگوں سے
مُؤْمِنِيْنَ : ایمان لانے والے
اَنْ تُؤْمِنَ : کہ وہ ایمان لائے
وَيَجْعَلُ : اور وہ ڈالتا ہے
عَلَى الَّذِيْنَ : ان لوگوں پر جو
قُلِ انْظُرُوْا : آپ کہیے کہ تم لوگ دیکھو
فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : آسمانوں اور زمین میں ہے
وَالنُّذُرُ : اور ڈرانے والے
لَا يُؤْمِنُوْنَ : جو ایمان نہیں لاتے
مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ : ان لوگوں کے دنوں کی طرح

لَا يُؤْمِنُوْنَ : وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے
كُلُّ اٰيَةٍ : ہر ایک نشانی
الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ : دردناک عذاب کو
اٰمَنَتْ : جو ایمان لاتی
اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ : سوائے یونسؑ کی قوم کے
كَشَفْنَا عَنْهُمْ : تو ہم نے کھول دیا ان سے
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا : دنیوی زندگی میں
اِلٰى حِيْنٍ : ایک مدّت تک
لَاٰمَنَ : تو ضرور ایمان لاتے
كُلُّهُمْ : ان کے کُل
اَفَاَنْتَ : تو کیا آپؐ
حَتّٰى يَكُوْنُوْا : یہاں تک کہ وہ ہو جائیں
وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ : اور (ممکن) نہیں ہے کسی جان کے لیے
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ : مگر اللہ کی اجازت سے
الرِّجْسَ : گندگی کو
لَا يَعْقِلُوْنَ : عقل نہیں کرتے
مَاذَا : اس کو جو
وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ : اور کام نہیں آتیں نشانیاں
عَنْ قَوْمٍ : ایسے لوگوں کے
فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا : تو وہ لوگ کیا انتظار کرتے ہیں سوائے
خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ : جو گزرے ان سے پہلے

قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا : آپؐ کہہ دیجیے پس تم لوگ انتظار کرو

مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ : انتظار کرنے والوں میں سے ہوں

رُسُلَنَا : اپنے رسولوں کو

كَذٰلِكَ : اسی طرح (ہے)

نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ : (کہ) ہم بچالیں ایمان لانے والوں کو

اِنِّيْ مَعَكُمْ : بے شک میں (بھی) تمہارے ساتھ

ثُمَّ نُنَجِّيْ : پھر ہم بچا لیتے ہیں

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا : اور ان کو جو ایمان لائے

حَقًّا عَلَيْنَا : حق ہوتے ہوئے ہم پر

نوٹ ۱ : آیت ۹۳ کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دین میں جو تفرقے کیے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کو حقیقت کا علم نہیں تھا اور ناواقفیت کی بنا پر انہوں نے ایسا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان کے اپنے نفس کی شرارتوں کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو انہیں واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ دین یہ ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اللہ کی دی ہوئی بنیادوں کو چھوڑ کر کچھ دوسری بنیادوں پر اپنے فرقوں کی بنیادیں کھڑی کر لیں۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲ : آیات ۹۴۔۹۵ میں ایک خاص اندازِ خطاب اختیار کیا گیا ہے جس کے لیے پنجابی کی ایک کہاوت ہے کہ ''کہنا بیٹی کو تو سنانا بہو کو''۔ اس پر اتفاق رائے ہے کہ ان آیات میں یہی اندازِ خطاب اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ اس بات پر دو آراء ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خطاب کر کے دراصل کس کو سنانا مقصود ہے۔

(۱) حضرت قتادہؒ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ نہ میں شک کرتا ہوں اور نہ مجھے پوچھنے کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں امت کو ثابت قدم رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ (ابن کثیر) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں دراصل اُمّت کے ایسے افراد کو سنانا مقصود ہے جو ایمان کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن دل میں کچھ شکوک وشبہات بھی ہوتے ہیں۔ اللہ کے احکام کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن اپنے عمل سے اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ جیسے تسلیم کرتے ہیں کہ نماز فرض ہے لیکن پڑھتے نہیں ہیں' وغیرہ۔

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ ان لوگوں کو سنانا مقصود ہے جو سب کچھ سمجھنے کے باوجود محض اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار اور تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی اس روش پر اظہارِ ناراضگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے براہِ راست ان کو خطاب کرنے کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے خطاب کر کے ان کو سنایا ہے۔ (تدبر قرآن سے ماخوذ) زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان آیات کی دونوں آراء کو جامع سمجھا جائے۔

نوٹ ۳: حضرت یونس علیہ السلام کا زمانہ ۸۶۰ ق م سے ۷۸۴ قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ اگرچہ اسرائیلی نبی تھے' مگر ان کو اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا۔ اسی لیے اشوریوں کو یہاں قومِ یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کا مرکز نینویٰ کا مشہور شہر تھا۔ اس قوم کے عروج کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کا دار

السلطنت نینویٰ تقریباً ساٹھ میل میں پھیلا ہوا تھا۔ جب یہ قوم ایمان لے آئی تو اس کی مہلتِ عمر میں اضافہ کر دیا گیا۔ بعد میں اس نے پھر گمراہیاں اختیار کرنا شروع کر دیں۔ ناحوم نبی (۷۲۰ تا ۶۹۸ ق م) نے آخری وارننگ دی، خبردار کیا، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر صفنیاہ نبی مبعوث ہوئے (۶۴۰ تا ۶۰۹ ق م) مگر ان کا خبردار کرنا بھی کارگر نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے میڈیا والوں کو ان پر مسلط کر دیا۔ اشوری فوج شکست کھا کر نینویٰ میں محصور ہو گئی۔ کچھ مدت تک اس نے سخت مقابلہ کیا۔ پھر دجلہ کی طغیانی نے شہر کی فصیل توڑ دی اور حملہ آور اندر گھس گئے۔ پورا شہر جلا کر خاک کر دیا۔ اشور کا بادشاہ اپنے محل میں آگ لگا کر جل مرا۔ اس کے ساتھ ہی اشوری سلطنت اور تہذیب بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ زمانۂ حال میں آثار قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں ان میں آتش زدگی کے نشانات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۱۰۴ تا ۱۰۹

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾﴾

ترجمہ:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ : آپؐ کہیے اے لوگو

اِنْ كُنْتُمْ : اگر تم لوگ ہو

فِيْ شَكٍّ : کسی شک میں

مِّنْ دِيْنِيْ : میرے دین سے

فَلَآ اَعْبُدُ : تو میں (تو) بندگی نہیں کرتا

الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ : ان لوگوں کی جن کی تم بندگی کرتے ہو

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ

وَلٰكِنْ اَعْبُدُ : اور لیکن (یعنی بلکہ) میں بندگی کرتا ہوں

اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ : اس اللہ کی جو پورا پورا لے لیتا ہے تم کو (یعنی موت دیتا ہے)

وَاُمِرْتُ : اور مجھے حکم دیا گیا ہے

أَنْ أَكُوْنَ : کہ میں ہو جاؤں

وَأَنْ أَقِمْ : اور یہ کہ تو سیدھا رکھ

لِلدِّيْنِ : دین کے لیے

وَلَا تَكُوْنَنَّ : اور تو ہرگز مت ہونا

وَلَا تَدْعُ : اور تو مت پکار

مَا لَا يَنْفَعُكَ : اس کو جو نفع نہیں دیتا ہے تجھ کو

فَإِنْ فَعَلْتَ : پھر اگر تُو نے (ایسا) کیا

مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ : ظلم کرنے والوں میں سے ہے

بِضُرٍّ : کسی تکلیف سے

إِلَّا هُوَ : مگر وہ (یعنی اللہ)

بِخَيْرٍ : کسی بھلائی کا

لِفَضْلِهٖ : اس کے فضل کو

مَنْ يَّشَآءُ : اس کو جس کو وہ چاہتا ہے

وَهُوَ : اور وہی

الرَّحِيْمُ : ہمیشہ رحم کرنے والا ہے

قَدْ جَآءَكُمُ : تحقیق آ چکا ہے تمہارے پاس

مِنْ رَّبِّكُمْ : تمہارے رب (کے پاس) سے

فَإِنَّمَا : تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ

لِنَفْسِهٖ : اپنے آپ کے لیے

فَإِنَّمَا : تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ

عَلَيْهَا : اس پر (یعنی اپنی جان پر)

عَلَيْكُمْ : تم لوگوں پر

وَاتَّبِعْ : اور آپؐ پیروی کریں

إِلَيْكَ : آپؐ کی طرف

حَتّٰى : یہاں تک کہ

وَهُوَ : اور وہ

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ : ایمان لانے والوں میں سے

وَجْهَكَ : اپنے چہرے کو

حَنِيْفًا : یکسو ہوتے ہوئے

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ : شرک کرنے والوں میں سے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ

وَلَا يَضُرُّكَ : اور نہ ہی تکلیف (نقصان) دیتا ہے تجھ کو

فَإِنَّكَ إِذًا : تو بے شک تُو اُس وقت

وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ : اور اگر چھوئے تجھ کو اللہ

فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ : تو کوئی بھی کھولنے والا نہیں ہے اس کو

وَإِنْ يُّرِدْكَ : اور اگر وہ ارادہ کرے تیرے لیے

فَلَا رَآدَّ : تو کوئی بھی لوٹانے والا نہیں ہے

يُصِيْبُ بِهٖ : وہ پہنچاتا ہے اسے (یعنی فضل)

مِنْ عِبَادِهٖ : اپنے بندوں میں سے

الْغَفُوْرُ : بے انتہا بخشنے والا ہے

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ : آپؐ کہیے اے لوگو

الْحَقُّ : حق

فَمَنِ اهْتَدٰى : پس جس نے ہدایت پائی

يَهْتَدِيْ : وہ ہدایت پاتا ہے

وَمَنْ ضَلَّ : اور جو گمراہ ہوا

يَضِلُّ : وہ گمراہ ہوتا ہے

وَمَآ أَنَا : اور میں نہیں ہوں

بِوَكِيْلٍ : کوئی اختیار والا

مَا يُوْحٰى : اس کی جو وحی کیا گیا

وَاصْبِرْ : اور آپؐ صبر کریں

يَحْكُمَ اللّٰهُ : فیصلہ کرے اللہ

خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ : فیصلہ کرنے والوں کا بہترین ہے

مباحثِ عقیدہ (۲)

مؤمن محمود

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

گزشتہ شمارہ میں یہ گفتگو ہو چکی ہے کہ امام بیہقی رحمہ اللہ کے نزدیک سب سے پہلا واجب ایمانیات ثلاثہ ہے' یعنی اللہ پر ایمان' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی شہادت اور آخرت پر ایمان۔ کچھ دوسرے علماءِ اصول دین' علماءِ متقدمین کے ہاں پہلا واجب غور و فکر ہے' اور بعض کے نزدیک پہلا واجب معرفت ہے۔ یہ سب باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی جو غور و فکر مدِّنظر ہے وہ انسان کو معرفت کی طرف لے کر جائے گا اور پھر آخر الامر معرفت خود مقصود ہے۔ ایسی معرفت جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت پر انسان کو آمادہ کر سکے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ کی تشریح میں بیان کرتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی مراد ہے کہ ''مَیں نے جِنّوں اور انسانوں کو صرف اس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری معرفت حاصل کریں''۔ البتہ یہ ذہن میں رہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کی معرفت اپنی ذات میں مقصود نہیں' بلکہ ایسی معرفت مقصود ہے جو اللہ کی عبادت پر انسان کو آمادہ کرے۔ ورنہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ معرفت محض ایک ذہنی مشق' ایک فلسفیانہ خیال بن کر رہ جائے۔ تو ایسی معرفت مطلوب نہیں۔ کیونکہ دین کا اصل مقصود: ''تقرب اِلی اللہ'' ہے۔ اس لیے غور کیا جائے تو اصلاً پہلا واجب ہی آخری واجب بھی ہے۔ پہلا واجب یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرۃ' دین کے تمام اعمال اور علوم کا مقصود ہے۔ یعنی اگر ایک لفظ میں پوچھا جائے کہ دین کیا ہے؟ تو دین میں جتنے اعمال ہیں' دین میں جتنے علوم ہیں' چاہے علومِ آلیہ — انسٹرومنٹل سائنسز — ہیں یا علومِ عالیہ ہیں' یہ سب ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ تو اس کا جواب ہوگا التقرب الی اللہ: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قریب ہونا۔

تو یہ بات ایک طالب علم کو پہلے دن سے واضح ہونی چاہیے کہ وہ علم حاصل کیوں کر رہا ہے۔ چاہے نحو کا علم ہے' جو کہ علم آلہ ہے' جو فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے۔ تو کیوں حاصل کر رہا ہے؟ وہ اس لیے حاصل کر رہا ہے کہ کچھ علوم ایسے ہیں جو فی نفسہٖ مقصود ہیں ان کا فہم علم نحو پر موقوف ہے' اس کا دارومدار علم نحو پر ہے' تو گویا اُس نے جو بھی تدریج اختیار کر لی ہے اس میں الٹی میٹ گول کو پیش نظر رکھنا ہے۔ علم نحو' علم الصرف' علم بیان' علم بدیہی' علم معانی وغیرہ کیوں سیکھے جاتے ہیں؟ تاکہ قرآن مجید کو سمجھ سکیں! تو قرآن مجید نحو کے مقابلے میں علم عالی ہے' آلی نہیں ہے' بلکہ فی نفسہٖ مقصود ہے۔ لیکن کیا قرآن مجید کی تفسیر فی نفسہٖ مقصود ہے؟ نہیں۔ یہ صرف اس لیے مقصود ہے کہ اللہ کی مراد جانی جا سکے۔ علم تفسیر کیا ہے؟ علم تفسیر یہ ہے کہ قرآن مجید سے انسانی استعداد کے بقدر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مراد جان سکیں۔ کیا اللہ کی

مراد کو جان لینا فی نفسہ مقصود ہے؟ نہیں! بلکہ اللہ کی مراد کو جان کر اس پر عمل کرنا مقصود ہے' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قریب ہونا مقصود ہے۔ گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کی ممکنہ معرفت' اس کی صفات کی معرفت اور ایسی معرفت جو انسان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے محبّت کروادے اور انسان کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قریب کردے' دین کا مقصود ہے۔ المختصر دین کا مقصود اللہ کی عبادت ہے' اللہ کا تقرّب ہے' اللہ کے قریب ہونا ہے' اللہ کے سامنے جھک جانا ہے' اللہ کے سامنے عاجزی اختیار کرنا ہے۔ لہٰذا علماء کے نزدیک جو پہلا واجب ہے وہی آخری واجب ہے۔ مکرر عرض کیا جاتا ہے کہ پہلا واجب کیا تھا؟ اللہ کی معرفت۔ اور باقی جتنے واجبات اس کے بعد آتے ہیں ان سب کا مقصد اسی پہلے واجب میں اضافہ کرنا' یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت ہی میں اضافہ کرتے چلے جانا' یہ دین کے تمام اعمال اور علوم کا مقصود ہے۔ اور اگر یہ شے پیش نظر نہ رہے تو پھر چاہے وہ علم دین ہو' چاہے وہ علم تفسیر ہو' وہ علم الضَّار یعنی نقصان پہنچانے والا علم ہو جاتا ہے۔ علم نافع کی ایک عام تعریف کیا ہے؟ کل علم یقربک الی اللہ سبحانہ وتعالیٰ فھو العلم النافع ''ہر وہ علم جو تمہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قریب کردے وہ علم نافع ہے''۔ وکل علم یبعدک عن اللہ سبحانہ وتعالیٰ فھو العلم الضار ''اور ہر وہ علم جو تمہیں خدا سے دور کرے وہ علم الضار یعنی نقصان پہنچانے والا علم ہے''۔ علماء کے بقول چاہے وہ تصوف ہی کیوں نہ ہو' وہ علم تفسیر ہی کیوں نہ ہو' اگر وہ اللہ سے دور کر رہا ہے تو یہ علم الضَّار ہے۔ لہٰذا حدیث میں وارد ہوا کہ: ((اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عَالِمٌ لَمْ یَنْفَعْہُ اللّٰہُ بِعِلْمِہٖ)) (شعب الایمان) ''سب سے بڑھ کر عذاب کا مستحق قیامت کے دن وہ عالم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے علم سے نفع نہیں دیا''۔ گویا اُس نے علم دین حاصل کیا کہ وہ خدا کے قریب ہو' لیکن وہ اسی علم دین کی وجہ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دور ہو گیا تو ایسا شخص سب سے بڑھ کر عذاب کا مستحق ہے۔

علم عقیدہ اصلاً کیا ہے؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں ضروری علم کہ جس کی بنا پر ہماری عبادات درست ہو جائیں۔ اللہ کی عبادت کچھ شرائط کے ساتھ کی جاتی ہے' اس کے بغیر اللہ کی عبادت قبول نہیں ہے۔ ان میں سے ایک ہے: ''علم صحیح'' اور دوسری ''عمل صحیح''۔ علم صحیح کیا ہے؟ کہ جس کی عبادت کی جائے' اُس کو ویسے ہی پہچانا جائے جیسا کہ اُس نے اپنا تعارف کروایا ہے' قرآن مجید میں یا اللہ کے نبی ﷺ کی زبانی۔ اور عمل صحیح کیا ہے؟ کہ جو عبادت کی جائے وہ اللہ کے نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر ہو۔ تو یہ دو شرطیں ہیں۔ پہلی شرط علم صحیح کی ہے دوسری شرط عمل صحیح کی ہے۔ اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ کئی دفعہ ہمارے ہاں علم کی اہمیت کچھ کم کر دی جاتی ہے اور ہم کہتے ہیں کہ اصل شے اخلاص ہے۔ یہ بات ایک لحاظ سے تو درست ہے کہ اخلاص بہت بڑی شے ہے' لیکن اگر علم صحیح نہ ہو تو یہ اخلاص وبالِ جان بھی ہو سکتا ہے اور یہ اخلاص انسان کو دین سے ایسے نکلنے پر آمادہ بھی کر سکتا ہے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ کے نبی ﷺ نے جو خوارج کی مثال دی ہے تو ان کے ہاں اخلاص کی کمی نہیں تھی' ان کے ہاں للّٰہیت زہد' تقویٰ اور ورع کی کمی نہیں تھی۔ ان کے ہاں جس شے کی کمی تھی وہ علم صحیح تھا۔ لہٰذا ان کا علم انہیں اس بات پر آمادہ کرتا تھا کہ صحابہ کی بھی تکفیر کر دی جائے' صحابہ کو بھی کافر کہہ دیا جائے۔ ان کے بارے میں اللہ کے

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے ہیں کہ ((تَحْقِرُوْنَ صَلَاتَكُمْ مَعَ صَلَاتِهِمْ ، وَصِيَامَكُمْ مَعَ صِيَامِهِمْ، وَعَمَلَكُمْ مَعَ عَمَلِهِمْ ، وَيَقْرَؤُوْنَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ)) ''تم اپنی نماز کو ان کی نماز کے سامنے حقیر جانو گے، اپنے روزوں کو اُن کے روزوں کے آگے اور اپنے اعمال کو اُن کے اعمال کے آگے حقیر جانو گے۔ وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن اُن کے حلقوں سے آگے نہیں بڑھے گا۔'' لیکن ان کی کیفیت کیا ہوگی ((يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ)) (صحیح البخاری) ''دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسا کہ تیر کمان سے نکل جائے''۔ اور یہاں دین سے نکلنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ کافر ہو جائیں گے، بلکہ دین کی حقیقت سے نکل جائیں گے۔

چونکہ پہلا واجب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت ہے۔ اس لیے اس میں ہر شخص کو، چاہے وہ عامی ہو، دلیل اجمالی حاصل ہونا ضروری ہے۔ اور دلیل اجمالی کیا ہے؟ کہ اگر پوچھا جائے کہ اللہ، رسول اور آخرت کو کیوں مانتے ہو؟ تو کوئی نہ کوئی دلیل دے۔ اس حوالے سے علماء کلام نے بہت خوبصورت واقعہ ایک اعرابی کا بیان کیا ہے۔ ایک اعرابی بدو شخص ہے، اس سے پوچھا گیا: كيف عرفتَ الرّب؟ ''تم نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟'' تو اس نے جواب دیا کہ ''البعرة تدل على البعير'' اس نے اپنے مشاہدے سے جواب دیا کہ جو مینگنی ہوتی ہے وہ بتا رہی ہوتی ہے کہ یہاں سے اونٹ گزرا ہے۔ اور پھر کہتا ہے کہ ''والاثر يدل على المسير'' اور اگر کچھ قدموں کے نشان پیچھے رہ جائیں تو دلیل اس بات کی ہے کہ قافلہ گزر گیا۔ پھر کہتا ہے کہ ''فسماء ذات ابراج وارض ذات فجاج افلا تدلُّ على العليم الخبير'' اگر یہ مینگنی اونٹ پر دلیل ہے اور نقش پا گزرنے والے پر دلیل ہے تو کیا یہ آسمان جو ستاروں والا ہے اور یہ جو زمین کشادہ رستوں والی ہے کیا یہ العلیم الخبیر پر دلیل نہیں ہے؟ تو بس یہ ایک اجمالی دلیل ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ زمین و آسمان کی جو تخلیق ہے وہ ایک خالق کی صناعی ہے:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰﴾ (آلِ عمران)

اسے آفاقی مشاہدہ بطور دلیل حاصل ہے اور یہ بہت قوی دلیل ہے، لہٰذا تقریباً ہر شخص جو بھی سچا مسلمان ہے وہ کسی نہ کسی اعتبار سے علیٰ وجہ البصیرہ ہوتا ہے، چاہے وہ اپنی دلیل کو صحیح طریقے پر بیان نہ کر سکے، لیکن کوئی نہ کوئی دلیل اجمالی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وجود پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر وہ رکھتا ہے۔ اور یہی دلیل اجمالی ہے جو اسے ایمان میں تقلید سے نکال دیتی ہے۔ کیونکہ متکلمین کے قول کے مطابق ایمان میں تقلید نہیں ہوتی۔ اگرچہ ایمان مقبول ہوگا لیکن گناہ کے ساتھ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جا بجا تقلید کو مذموم کہا ہے تو یہ مذموم تقلید دراصل ''اصولِ دین کی تقلید'' ہے۔ البتہ فروعِ دین میں تو تقلید از بس ضروری ہے۔

امام بیہقی علیہ الرحمہ نے اگلا عنوان جو قائم کیا ہے، وہ یہ ہے کہ جب اللہ پر ایمان ضروری ہے تو پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت حاصل کیسے ہوگی؟ اب اس میں دو رائے ہو سکتی ہیں۔ ایک رائے یہ ہو سکتی ہے جو دوسرے باب کا عنوان ہے:

''ذكر بعض مايستدل به على حدوث العالم وان محدثه ومدبره اله واحد قديم

لاشریک له ولا شبیه"

یعنی کچھ ذکر اس بات کا کہ وہ کیا کیا اشیاء ہیں جن کے ذریعے یہ دلیل پکڑی جاتی ہے کہ یہ عالم حادث ہے' یہ ہمیشہ سے نہیں ہے' بلکہ وجود میں آیا ہے۔ یعنی اس کا پیدا کرنے والا اور اس کا مدبر' تدبیر امر فرمانے والا وہ ایک الٰہ ہے' جو قدیم ہے' اس کا کوئی شریک اور شبیہ نہیں ہے' کوئی اس کے مانند نہیں ہے۔ ثانیاً ایک تصوّر یہ رہا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت بدیہی ہے۔ بدیہی کس کو کہتے ہیں' جس کے لیے غور وفکر کی ضرورت نہ ہو' یعنی خلقی / فطری (innate) ہو۔ ایک خالق و مالک تو ہے' سب جانتے ہیں' سب کے ذہنوں میں پہلے سے موجود ہے۔ عہدِ الست میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴾ (الاعراف)

"اور یاد کرو جب نکالا آپؐ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو اور اُن کو گواہ بنایا خود اُن کے اوپر' (اور سوال کیا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔ مبادا تم یہ کہو قیامت کے دن کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔"

اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ' فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ وَیُنَصِّرَانِهٖ وَیُمَجِّسَانِهٖ' كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِیْمَةُ بَهِیْمَةً جَمْعَاءَ' هَلْ تُحِسُّوْنَ فِیْهَا مِنْ جَدْعَاءَ ؟ ثُمَّ یَقُوْلُ ابوهریرة ؓ : ﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ۭ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ﴾ (متفق علیه)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ہر مولود فطرت پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اسے یہودی' نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں' جیسا کہ جب تم دیکھتے ہو کہ جب اونٹ کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ بالکل صحیح سالم ہوتا ہے' کیا تم اس میں کسی قسم کا نقص دیکھتے ہو؟ (مثال کے طور پر اس کا کان کٹا ہو' جیسے مشرکین بعد میں کان کاٹ دیتے ہیں۔ اسی طریقے پر انسانی بچہ بھی ہے' بعد میں اسے والدین مجوسی نصرانی بنا دیتے ہیں۔) اس کے بعد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "اللہ کی فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے' اللہ کے بنائے ہوئے کو بدلنا ممکن نہیں' یہی سیدھا دین ہے"۔ (الروم: ۳۰)

وضاحت: حدیث کے الفاظ ہیں: كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِیْمَةُ تو عموماً لوگ اس کو پڑھتے ہیں کہ كَمَا تَنْتِجُ الْبَهِیْمَةَ۔ لیکن بہر حال لغت کا قاعدہ یہ ہے کہ نُتِجَ یُنْتَجُ عموماً مجہول پڑھا جاتا اور یہ زیادہ افصح ہے۔ یعنی عربی زبان کے کچھ الفاظ ایسے ہی ہیں کہ جن کا مجہول پڑھنا ہی عربوں کے ہاں مستعمل ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان بنا دیتے ہیں۔ تو لوگوں نے یہاں سے دلیل قائم کی گویا وہ فطرتاً

مسلمان ہوتا ہے۔ جب وہ فطرتاً مسلمان ہوتا ہے تو اُسے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے' لہٰذا اللہ کی معرفت انسان کو پیدائش کے ساتھ حاصل ہے اور وہ بدیہی ہے' نظر و تامل اور غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے نبی ﷺ نے کسی نئے مسلمان ہونے والے سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہاری دلیل کیا ہے' کیا تم نے غور و فکر کیا؟ آپ ﷺ لوگوں کو دعوت دیتے ہوئے کہتے تھے: ''یا ایھا الناس قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا''۔

اس حدیث کے آخر میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اِقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ''۔ اگر تم چاہو تو (اس حدیث کی مانند) یہ آیت تلاوت کر دو:

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ ﴾ (الروم)

تو گویا وہ بتا رہے ہیں کہ فطرت اور اللہ کی معرفت بدیہی ہے۔ اور قرآن مجید کی آیت ہے:

﴿ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ﴾ (ابراھیم: ۱۰)

''ان کے پیغمبروں نے کہا کہ کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟''

تھیالوجی کا ایک سکول آف تھاٹ اس طرح کا بھی رہا ہے جس کے مطابق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت پر دلائل قائم کرنے چاہئیں۔ لیکن یہ سمجھنا کہ غور و فکر پر اس معرفت کا انحصار ہے یہ بات درست نہیں۔ بلکہ یہ معرفت تو ہر شخص کے اعماقِ دل میں موجود ہے۔ البتہ معاشرے کی آلودگی کی وجہ سے اس کی فطرت آلودہ (pollute) ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کو بھول جاتا ہے۔ اللہ کو تو یاد رکھنا ہے۔ اس کی نشانیوں کو دیکھ کر اللہ کے وجود کو جاننا نہیں بلکہ یاد کر لینا (recollection) ہے۔ کچھ اسی قسم کی بات' یونانی فلاسفہ میں سے افلاطون نے اپنے نظریہ علم میں کہی ہے۔

دوسری رائے جس سے اکثر علماءِ کلام' علماءِ عقیدہ متفق ہیں۔ اور یقیناً وہ لوگ پہلی رائے کے دلائل کو جانتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت اس معنی میں بدیہی نہیں کہ ہر انسان جانتا ہے۔ فطرت سے مراد پہلے سے رکھے گئے علوم نہیں ہیں' بلکہ فطرت سے مراد وہ استعداد ہے کہ اگر اس کو صحیح حالت پر چھوڑ دیا جائے گا تو وہ فطری استدلات کی روشنی میں خدا کی معرفت تک پہنچ جائے گی۔ گویا خدا کی معرفت استدلال کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے اور ہمارے متکلّمین نے کہا کہ بدیہیات میں اختلاف نہیں ہوتا۔ خدا کے وجود میں تو کثرت سے اختلاف ہے کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر ایمان بغیر استدلال کے حاصل ہو جائے' لیکن قرآن مجید مستقل استدلال کی دعوت بھی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ غور و فکر کرو۔ ان کے نزدیک حدیث کہ ''ہر مسلمان فطرت پر پیدا ہوتا ہے'' کا مطلب ہی یہی ہے۔ کیونکہ مسلم کی ایک اور روایت کے مطابق اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ''فَاِنْ کانا مُسلِمَین فَمُسْلِم'' اگر اس کے والدین مسلمان ہوں تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ یعنی عموماً دلیل پیش کی جاتی ہے کہ مسلمان ہونے کا ذکر نہیں ہوا۔ گویا وہ اس کی فطری حالت ہے کہ اس کے والدین اس کو عیسائی نصرانی' یہودی' مجوسی بنا دیتے ہیں' وہ مسلمان نہیں بناتے۔ لیکن مسلم کی یہ حدیث بتا رہی ہے

کہ اگر والدین مسلمان ہوں تو اولاد کے بھی مسلمان ہونے کے قوی امکان موجود ہیں۔ تو ہمارے علماء نے کہا کہ فطرت ایک استعداد کا نام ہے کہ اگر فطرت صحیح رہے گی تو لازماً انسان دین حق کو قبول کر لے گا۔ یہ نہیں ہے کہ دین حق جزئیات وتفصیلات کے ساتھ پہلے سے موجود تھا' بلکہ دین حق کو قبول کرنے کی استعداد پہلے سے موجود تھی اور جیسے ہی نبی کی دعوت آئے گی اور دلائل عقلیہ اور نقلیہ' عقل اور نقل یعنی وحی کے دلائل سامنے آئیں گے تو یہ شخص فوراً لپک کر اسے قبول کر لے گا۔ تو ان لوگوں نے یہ کہا کہ آپ نے اس آیت کا حوالہ تو دے دیا' لیکن ایک اور آیت بھی ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸﴾ (النحل)

''اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے ایسے نکالا''--- ''ایسے نکالا'' ترجمہ کیوں کیا ہے؟ اس لیے کہ اگر اس کی نحوی ترکیب پر غور کیا جائے' وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ یہ جو كُمْ کی ضمیر آ رہی ہے مخاطب کی' لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا اس کا جملہ حالیہ ہے' کیونکہ یہ عطف کے بغیر آ رہا ہے۔ تو ترجمہ کیا بنے گا کہ اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حالت میں نکالا کہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا، تمہاری حالت یہ تھی۔ اس آیت میں اگر غور کریں تو لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا نکرہ ہے اور نکرہ کے بارے میں عربی میں قاعدہ یہ ہے کہ نفی کے سیاق میں نکرہ آ جائے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی اگر آپ کہیں کہ مَا جَاءَنِیْ رَجُلٌ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص نحوی ہو اور اس نے ابھی ابھی نحو کی کوئی کتاب پڑھی ہو' وہ کہے کہ رَجُلٌ تو نکرہ ہوتا ہے' اس کا مطلب ہے کہ ایک آدمی ہوا' عموماً ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''میرے پاس ایک آدمی نہیں آیا''۔ لیکن یہاں چونکہ نفی کا سیاق ہے تو ترجمہ ہوگا ''ایک بھی نہیں آیا''۔ تو نفی کے سیاق میں عموم پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی مَا جَاءَ نِیْ رَجُلٌ کا مطلب ہے مَا جَاءَنِیْ اَیُّ الرَّجُل۔ کسی قسم کا کوئی آدمی میرے پاس نہیں آیا۔ اب یہاں کیا ہے شَيْـًٔا نکرہ ہے اور لَا نفی ہے تو لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ''کچھ بھی نہیں جانتے تھے''۔ تو انہوں نے کہا کہ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا میں اس کی تفصیل اس لیے بتائی گئی ہے تاکہ پتا چل جائے کہ ہمارے علماء کتنا دَقیق معیار رکھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ بس یوں حوالہ دیا اور گزر گئے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کی تفسیر پڑھیں تو پتا چلے گا کہ ہر لفظ پر رُک کے پوچھیں گے کہ یہ کیوں ہے؟ اور ایسا کیوں ہے؟ مثال کے طور پر ہم آیت پڑھتے ہیں:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۲۴﴾ (البقرة)

اب اس پر رہنمائی فرماتے ہیں کہ ''اِنْ'' کیوں آیا ''اِذَا'' کیوں نہیں آیا' حالانکہ دونوں مستقبل میں شرط کا معنی دیتے ہیں۔ پھر فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا آیا تو ''تَاْتُوْا'' کیوں نہیں آیا' کیونکہ پیچھے تو تھا: فَاْتُوْا' تو اس کے متوازی آنا چاہیے تھا ''فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْا'' اگر تم وہ کتاب یعنی قرآن مجید جیسا کلام نہ لے کر آ سکے۔ تو ''تَفْعَلُوْا'' کیوں آیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو ہر لفظ پر رُک کر رہنمائی کیوں فرما رہے ہیں؟ کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی نے

بول دیا تو وہ بس کہہ کر چلا گیا۔نہیں! یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے‘اس کا ہر ہر لفظ شک سے مبرا ہے۔

’’لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا‘‘ کی جگہ لاعلمکم بای شیئ بھی ہوسکتا تھا‘لیکن اسم کی بجائے فعل اس لیے آیا کہ اس سے دلیل نکلی کہ بالفعل علم نہیں ہوتا‘ بِالقُوّۃ ہوسکتا ہے۔ کچھ حقائق کا علم جو بِالقُوّہ حالت میں ہوں وہ وقت کے ساتھ ساتھ نکھر کر سامنے آتے رہیں گے‘اس کی نفی نہیں کی گئی۔امام رازی علیہ الرحمۃ اس آیت (النحل:۷۸) پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کی ابتداء‘اس کا مقصد وجود اور مقصد وجود کے پانے کے آلات وذرائع سب اس آیت میں بتا دیے گئے ہیں۔ہم پیدائش کے بعد ایک دودھ پیتے بچے کی حیثیت میں کچھ نہیں جانتے‘ تو کیا اسی لاعلمی اور جہالت میں پوری زندگی گزار دیں؟ ہرگز نہیں۔

تو’’لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا‘‘ اسی آیت کی تشریح ہے۔ یہاں علماء نے سوال یہ اٹھایا کہ ’’لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا‘‘ ہے‘ یہاں یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ﴿وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ﴾ لاعلمکم بأی شیئ۔ لیکن فعل آیا ہے اسم نہیں آیا۔ تَعْلَمُوْنَ فعل ہے۔تو گویا اس سے یہ دلیل نکلی کہ علم بالفعل نہیں ہوتا بالقوہ ہوسکتا ہے۔ ’’لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا‘‘ میں جب بچہ ماں کے پیٹ سے نکل رہا ہے تو بالفعل تو علم کی نفی ہے لیکن کچھ علوم جو بالقوہ حالت میں ہوں‘ جو وقت کے ساتھ ساتھ نکھر کر ابھر کر سامنے آتے رہیں‘ ان کی نفی نہیں کی۔اور یہ آیت اتنی خوبصورت ہے کہ جس سے معلوم ہوجانا چاہیے کہ علوم کا مقصد کیا ہے؟ اللہ کی رضا‘ اللہ تک پہنچنا۔اس آیت میں سب کچھ بتا دیا۔امام رازی علیہ الرحمہ اس آیت پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کا مقصد وجود کیا ہے؟ اور اس مقصد وجود تک پہنچنے کے اس کے پاس آلات اور ذرائع کیا ہیں؟،سب اس آیت میں بتا دیے ہیں۔﴿وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ﴾ یہاں انسان کی بالکل ابتدائی حالت اس کے مبدأ کا بیان ہو رہا ہے اور اس کی حالت کا بیان ہے: ’’لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا‘‘ یعنی کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔تو کیا اب جہالت ہی میں پوری زندگی گزاریں؟ نہیں! تمہاری معراج وہاں تک پہنچنا ہے جو آیت کے آخر میں آرہی ہے۔فرمایا:﴿وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ﴾۔ ذرائع علم کو ہمارے علماء تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: ’’سمع، ابصار اور افئدۃ سمعی دلیل‘ حسّی دلیل‘ اور عقلی دلیل۔تو وہ فرماتے ہیں کہ سمع سے مراد ہے سمعی دلیل جو خبر صادق سے حاصل ہوتی ہے‘ نبی کے بتانے سے حاصل ہوتی ہے۔ابصار سے مراد حواسِ خمسہ کے علوم ہیں‘ اور افئدۃ سے مراد کچھ بدیہی علوم ہیں‘ جن کے نتیجہ میں انسان تعقل کر کے نظری علوم پیدا کر لیتا ہے۔

اسی آیت میں ذرائع علم کی نشاندہی کے ساتھ ﴿وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ﴾ علوم کو حاصل کرنے کے بعد اس سب کا حاصل بھی بتایا گیا‘ اور وہ ہے خالق حقیقی کی شکر گزاری:﴿لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ﴾۔ یعنی ان علوم کے ذریعے اِلٰہ واحد کی ایسی معرفت پیدا کرنی ہے کہ جس کے نتیجے میں تم اللہ کے شکر گزار بندے بن جاؤ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احسان کے بوجھ تلے اپنے آپ کو محسوس کرو۔ چنانچہ علم کی انتہا شکر ہے‘ جیسے قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ﴾۔ گویا علم وحکمت کی معراج‘ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا

شکر ہے۔تمام علوم وفنون کے ذریعے عقلی ترقی وعروج پر پہنچ کر اللہ کی پہچان حاصل کر کے اس کے سامنے سرِتسلیم خم کردو اور اس کے سامنے گر جاؤ اور شکر کے جذبات کا اظہار کرو۔ چنانچہ ہمارا مقصود ہے کہ ان علوم کے ذریعے اس ترقی اور اس عروج پر پہنچا جائے کہ اللہ کو پہچان کر اس کے سامنے سرِتسلیم خم ہو اور اُس کے سامنے گرا جائے اور شکر کے جذبات پیدا ہوں۔تو فرمایا کہ یہاں سے پتا چل رہا ہے کہ ''بالفعل'' علم نہیں ''لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا'' تو یہ علم کیسے حاصل کرنا ہے؟ سماعت وبصارت اور اَفْئِدَۃ کے ذریعہ۔لہٰذا وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں مستقل غور وفکر کی دعوت ہے۔یعنی مثال کے طور پر جن آیات کا انہوں نے حوالہ دیا ہے انہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔سب سے پہلے انہوں نے ایک روایت سبب نزول کے بیان میں نقل کی ہے جو حسن درجہ کی ہے کہ جب سورۃ البقرۃ کی آیت نازل ہوئی: ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾﴾ تو مشرکینِ مکّہ نے سوال کیا: اچھا آپ نے اللہ کی توحید کا بیان کیا ہے کہ اللہ ایک وجود رکھتا ہے اور معبودِ واحد ہے۔کیا آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے؟ تو دلیل کے طور پر اگلی آیت نازل ہوئی جس کو ''آیۃُ الآیات'' کہتے ہیں۔ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾

''یقیناً آسمان اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اُس پانی میں کہ جو اللہ نے آسمان سے اُتارا ہے پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو معلّق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

اس غور وفکر کے نتیجے میں جو مقصود تھا وہ اس سے اگلی آیت میں آ رہا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾﴾

''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو اس کا ہمسر اور مدِّمقابل بنا دیتے ہیں' وہ ان سے ایسی محبّت کرنے لگتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے۔اور جو لوگ واقعتاً صاحبِ ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبّت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔اور اگر یہ ظالم لوگ اُس وقت کو دیکھ لیں جب یہ دیکھیں گے عذاب کو' تو (ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ) قوت تو ساری کی ساری اللہ کے پاس ہے' اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ عقل رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔اس کے بعد فرماتے ہیں قرآن مجید میں جا بجا غور وفکر کی دعوت ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۱۹۰﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں ہوش مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

﴿اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ﴾

''کیا یہ زمین وآسمان کی ملکوت (بادشاہت) پر غور وفکر نہیں کرتے اور جو بھی اللہ نے مخلوقات پیدا کی ہیں؟''

امام بیہقی رحمہ اللہ اس آیت کی شرح میں فرماتے ہیں: ملکوت سے مراد آیات ہیں۔اس آیت میں غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ زمین وآسمان کی ملکوت اور اللہ کی مخلوقات میں غور وفکر کرو' اور ایک اور شے میں بھی:

﴿وَّاَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ﴾ (الاعراف:۱۸۵)

''اُمید ہے (ممکن ہے' قریب ہے) کہ ان کا وقت مقرّر قریب ہی آچکا ہو۔''

اس میں اہم بات کیا ہے جو ہمارے مفسّرین نے کہی کہ آخری بات کہہ کر پہلا جو غور فکر کا حکم ہے اس کو صحیح رخ پر ڈالا ہے۔یعنی اگر انسان کو اپنی موت کا تصوّر مستحضر رہے تو اس کا غور وفکر صحیح نہج پر ہوگا۔ان شاء اللہ! وگرنہ ہوسکتا ہے وہ ایک ذہنی مشق ہو، اس کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔موت پیش نظر ہے' دنیا سے جانا ہے' وقت کم ہے' اسی وقت میں اللہ کی معرفت حاصل کرنی ہے' اسی میں اللہ کو پہچاننا ہے' تو پھر وہ غور وفکر ہوگا' تبھی یہ غور وفکر ایک صحیح نہج پر ہوگا، ایک صحیح طریقے پر ہوگا۔اسی طرح دیکھیں جس آیت کا انہوں نے بھی حوالہ دیا ہے:

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ﴾

''کہیے: ذرا دیکھو تو سہی زمین وآسمان میں کیا کچھ ہے؟''۔اور پھر فرمایا:

﴿وَ مَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۱۰۱﴾ (یونس)

''بے ایمان لوگوں کو نشانیاں اور ڈرانا یا ڈرانے والے فائدہ نہیں دیتے۔''

تو یہاں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ غور وفکر کی دعوت دے رہے ہیں۔اس کے علاوہ بھی قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔تو ایک نقطہ فکر یہ تھا کہ اللہ کی معرفت میں بڑھنے کے لیے غور وفکر اچھی بات ہے' لیکن اللہ کی معرفت کا انحصار اس پر نہیں ہے۔دوسرے نقطہ فکر کے نزدیک معرفت کا انحصار غور وفکر پر ہے' اور اگر غور وفکر کے بغیر معرفت ہو بھی گئی ہے تو غور وفکر کے نتیجے میں انسان اللہ کی معرفت میں مزید بڑھتا چلا جائے گا۔کس معرفت میں بڑھے گا؟ اللہ کی صفات کی معرفت میں' اللہ کی سُنن کی معرفت میں' لیکن اللہ کی ذات پردے میں رہے گی۔امام بیہقی علیہ الرحمہ اور دوسروں کا کہنا ہے کہ غور وفکر تو کرنا ہے' لیکن غور وفکر کا موضوع کیا ہوگا' کہاں غور وفکر کرنا ہے؟ اللہ کی ذات میں یا کہیں اور؟ پھر وہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق میں غور وفکر کرو۔اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (بعض نے کہا کہ حدیث ضعیف ہے)

'' تفکروا فی خلق اللہ ولا تتفکروا فی ذات اللہ '' اللہ کے خلق میں غور وفکر کرنا ہے اللہ کی ذات میں نہیں۔

تو پتا کیا چلا؟ غور وفکر ہم کریں گے' لیکن غور وفکر کا موضوع اور محل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات نہیں ہوگا۔ کیوں نہیں ہوگا؟ اس لیے کہ وہ ہماری ادراک کی سرحدوں سے ماوراء ہے اور یہ بات ہمارے تمام علماء عقیدہ بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ مثال کے طور پر عقیدہ طحاویہ کی مشہور عبارت ہے: ''کل ماخطر ببالک، فاللہ بخلاف ذالک'' جو تصوّر تمہارے ذہن میں وارد ہو وہ اللہ نہیں ہے' اللہ اس کے خلاف ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کا جو تصوّر تم قائم کرو گے یقین رکھ لو کہ وہ اللہ نہیں ہے' وہ اللہ نہیں ہوسکتا۔ آپ نے سنا ہے کہ

العجزُ عَن دَركِ الإدراكِ إدراكُ وَالبحثُ عَن كُنه الذَّات إِشراكُ

''اللہ کی ذات کی معرفت سے عاجز آجانا ہی ادراک ہے اور اللہ کی ذات کی کُنہ میں کھود کرید کرنا شرک ہے۔''

کیوں شرک ہے؟ ذات کا تصور انسان جو بھی قائم کرے گا اس بحث کے نتیجے میں وہ خدا نہیں ہوگا۔ تو اگر وہ اس تصور کی عبادت کر رہا ہے تو خدا کی عبادت نہیں کر رہا' بلکہ اپنے کسی خود ساختہ معبود' اپنے ذہن کی تخلیق کی عبادت کر رہا ہے۔ تو اب ہمارے سامنے یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ غور وفکر تو کرنا ہے لیکن غور وفکر کرنا ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نشانیوں میں' اللہ کی مخلوق میں' کیونکہ اللہ کی مخلوق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اَسماء وصفات کی تجلّی گاہ ہے' جہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات ظہور پذیر ہو رہی ہیں مخلوقات کے ذریعے۔ لہٰذا اس کتاب میں بھی اگلا باب اسماء الصفات کے بارے میں ہی ہے۔ وہ آگے بتا رہے ہیں کہ تم غور وفکر کرو گے تو اللہ کے اَسماء وصفات کی معرفت تمہیں حاصل ہوگی۔

اگلی بات یہ ہے کہ غور وفکر کر لیا اور خدا کو پہچان لیا' لیکن رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعوت ابھی تک نہیں پہنچی' تو اب پکڑ کتنی ہے؟ یعنی غور وفکر کے نتیجے میں جو باتیں معلوم ہوگئیں اب کیا وہ واجب ہیں؟ اللہ ان کی پکڑ کرے گا؟ انسان ان کا مکلّف ہو گیا یا نہیں ہوا؟ ٹھیک ہے' یہ مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں اہل سُنّت کی ایک سے زیادہ آراء ہیں۔ اہلِ سُنّت کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ ان دونوں آراء میں سے جو بھی رائے کسی نے اختیار کی وہ اہل سُنّت ہی شمار ہوں گے۔ البتہ ایک تیسری رائے ہے جو معتزلہ کی ہے۔ اہلِ سُنّت کا ایک بڑا گروہ ہے' جن میں شوافع اور مالکیہ شامل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک رسول نہیں آتا اور رسول کی دعوت نہیں پہنچتی کسی بھی بات پر پکڑ نہیں ہوتی' جن کو ہم عقیدے میں اشعری مکتب فکر کہتے ہیں۔ اور اشعری میں یہ سب شافعی مالکی شامل ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا توحید پر بھی پکڑ نہیں ہوگی۔ یعنی کسی بھی انسان کی پکڑ رسول کی حُجّت تمام کیے بغیر نہیں ہوگی۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن مجید میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کہتے ہیں: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ۱۶۵) ''یہ رسولؑ (بھیجے گئے) بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر تا کہ نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حُجّت (دلیل) رسولوں کے آنے کے بعد۔'' تو اس کا مفہوم مخالف کیا ہوا کہ رسول اگر نہیں آئے تو انسانوں کے پاس حُجّت باقی رہے گی۔ پھر کہتے ہیں کہ قرآن مجید آپ پڑھ جایئے۔ جتنے لوگ جہنّم میں داخل ہوتے ہیں' ان سے داروغہ سوال کیا کرتے ہیں؟ ایک جگہ پر نہیں قرآن میں کئی جگہوں پر' کوئی آٹھ دس جگہوں پر' ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ آیا ہے: ﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ

مِّنۡكُمۡ يَقُصُّوۡنَ عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِىۡ وَيُنۡذِرُوۡنَكُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا‌ؕ﴾ (الانعام:۱۳۰) ''اے جِنّوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمہارے پاس نہیں آ گئے تھے رسول تم ہی میں سے، جو سناتے تھے تمہیں میری آیات اور وہ تمہیں خبردار کرتے تھے تمہارے اس دن کی ملاقات سے؟'' تم جہنّم میں پہنچ گئے ہو تو رسول لازماً آئے ہوں گے۔ جواب میں کہیں گے: ﴿شَهِدۡنَا عَلٰٓى اَنۡفُسِنَا .....﴾ ''ہم گواہ ہیں اپنی جانوں پر....'' سورۃ الملک میں فرمایا: ﴿كُلَّمَاۤ اُلۡقِىَ فِيۡهَا فَوۡجٌ سَاَلَهُمۡ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَذِيۡرٌ ۝۸﴾ ''جب بھی ڈالا جائے گا اس (جہنّم) میں کسی گروہ کو تو اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟'' ﴿قَالُوۡا بَلٰى قَدۡ جَآءَنَا نَذِيۡرٌ فَكَذَّبۡنَا وَقُلۡنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ‌ۚ﴾ (الملک:۹) ''وہ کہیں گے: کیوں نہیں! ہمارے پاس خبردار کرنے والا آیا تھا، لیکن ہم نے اسے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا کہ اللہ نے کوئی شے نہیں اتاری''۔ تو یہ ایک بڑی دلیل ہے کہ جہنّم میں جانے والے کے پاس رسول آیا ہے، یعنی رسول کی دعوت پہنچی ہے۔ پھر قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ حَتّٰى نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا ۝۱۵﴾ (بنی اسرائیل)

''اور ہم عذاب دینے والے نہیں تھے یہاں تک کہ رسول بھیج دیتے۔''

اگرچہ اس آیت کی دو شرح ممکن ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''مُعَذِّبِيۡنَ'' سے مراد دنیا کا عذاب ہو، دنیا میں ہم عذابِ استیصال نہیں بھیجتے جب تک رسول کو نہیں بھیجتے۔ لیکن بعض نے کہا کہ یہ عذابِ عام ہے۔ (وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ اَیّ عَذَابٍ) یعنی اللہ کی سُنّت یہ ہے کہ وہ کوئی بھی عذاب نہیں دیتا جب تک رسول نہ بھیج دے۔ تو یہ اہلِ سُنّت کی اکثریت کی رائے ہے۔ یہ لوگ جن تک رسول کی دعوت نہیں پہنچی وہ ''اہلِ فترۃ'' شمار ہوتے ہیں۔ ''اہلِ فترۃ'' ان لوگوں کو کہتے ہیں جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے درمیان کے چھ سو سال کے عرصہ میں آئے ہوں اور رسول کی دعوت ان تک صحیح طریقے پر نہ پہنچی ہو۔ اور ہمارے علماء نے کہا ہے کہ چاہے وہ لوگ بعد میں آئے ہوں اسی سے ملحق ہو جائیں گے۔ رسول کی دعوت ان تک نہیں پہنچی یا پہنچی تو مسخ شدہ پہنچی، صحیح طریقے پر نہیں پہنچی، حُجّت کے ساتھ نہیں پہنچی وغیرہ وغیرہ تو ایسے لوگوں کا کیا ہوگا؟ تو کیا سارے جنّت میں چلے جائیں گے؟ یا ان کا کچھ اور حساب کتاب ہوگا؟

اس میں کچھ اختلاف ہے۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ ایسے لوگ صرف اس بنیاد پر دوزخ میں نہیں جائیں گے، اللہ تعالیٰ ان کا کوئی اور حساب کتاب کرے گا قیامت کے دن۔ وہ حساب کتاب کیا ہوگا؟ مسند احمد کی ایک صحیح روایت ہے جسے بہت سے علماء عقیدہ نے اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ میدان حشر میں ان کا امتحان لیں گے اور امتحان کی ایک صورت وہاں بیان کی گئی ہے۔ چار آدمی آ کر اللہ تعالیٰ سے کہیں گے کہ رسول آیا، لیکن میں بہت بوڑھا تھا، مجھے سمجھ نہیں آتی تھی، مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ رسول نے کیا کہا ''ماکنتُ افھم شیئا''۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے دیکھتے ہیں۔ دوسرے صاحب کہیں گے اور وہ مجنون تھے: ''جاءنی الرسول والاطفال یرمونني بالحجارۃ۔'' رسول اس

حالت میں آئے کہ بچے میرے پیچھے گلیوں میں مجھے پتھر مارا کرتے تھے' مجھے کیا پتا رسول نے کیا کہا' کیا نہیں کہا۔ وہ مجنون ہے۔ تیسرا آدمی کہے گا کہ میرے پاس رسول ہی نہیں آیا۔ ایک چوتھا آدمی ہوگا' وہ بھی عذر پیش کرے گا کہ نہ میں دیکھتا تھا نہ میں سنتا تھا یعنی وہ بینائی اور شنوائی دونوں سے محروم تھا۔ وہ کہے گا مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ ہوا کیا۔ ظاہری بات ہے اس کو کوئی نہیں بتا سکتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرمائیں گے کہ اچھا ٹھیک ہے۔ اب اگر میں تمہارے پاس رسول بھیجوں تو تم اس کی اطاعت کرو گے؟ اور اگر تم نے اس کی اطاعت کی تو تم جنّت میں جاؤ گے اور اگر تم نے اس کی نافرمانی کی تو دوزخ میں چلے جاؤ گے۔ تو ایک رسول اُن کی طرف مبعوث کیا جائے گا۔ تو رسول اُن کو لے کر چلے گا۔ دنیا میں رسول آ کر کیا کرتا ہے؟ رسول آتا ہے تو رسول کے پیچھے چلنے والوں کو تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں' جہاد ہے' قتال ہے اور قربانیاں ہیں۔ تو ایک جگہ آئے گی کہ کچھ آگ جلی ہوگی تو رسول ان سے کہے گا یہاں سے گزرنا ہے' اس کے اندر اُترنا ہے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ نہیں' سامنے آگ ہے ہم اس میں نہیں اتر سکتے' آگ سے بچنے کے لیے ہی تو ہم سارا کچھ کر رہے ہیں' آگ میں نہیں جائیں گے۔ کچھ لوگوں کو یہ بات یاد آجائے گی کہ جو رسول کی پیروی کرے گا اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کے لیے جنّت ہے' وہ وہاں اُتر جائیں گے۔ یہ ساری کہانی علامتی بھی ہوسکتی ہے' لیکن بہرحال اس میں اشارہ ہے کہ وہاں کچھ امتحان کی نوعیت ہو رہی ہے اہلِ فترۃ کے لیے۔ تو جو لوگ اُتر گئے آگ میں ان کے لیے برد اور سلام ہے اور وہ جنّت میں پہنچ جائیں گے۔ واللہ اعلم! چونکہ یہ خبر واحد ہے تو علماء عقیدہ اس پر قطعی عقیدہ نہیں بناتے' لیکن بہرحال ایک استشہاد کے طور پر کچھ لوگوں نے یہ بات بیان کی۔ تو پہلی رائے ہمارے سامنے کیا آئی کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ توحید پر بھی پکڑ نہیں کر رہے۔ یعنی جس تک رسول کی دعوت نہیں پہنچی اسے اس بنیاد پر جہنّم میں نہیں ڈال دیا جائے گا کہ تم دنیا میں مشرک تھے۔

ہمارا دوسرا گروہ احناف کا ہے، جو عقیدہ کے لحاظ سے ماتریدی ہے' لیکن فقہ کے اعتبار سے حنفی۔ اور یہ لوگ بھی اہل سُنّت میں سے ہی ہیں۔ یہ دوسری رائے ان کی ہے اور دونوں آراء درست ہیں۔ لہٰذا کچھ لوگوں نے ایک رائے بیان کی ہے کچھ نے دوسری' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد علیہ الرحمہ ماتریدی مکتب فکر کی رائے سے متفق تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات کی معرفت کی پکڑ ہوگی۔ اور وہ کچھ صفات کیا ہیں؟ ان میں صفت توحید بھی ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فروعات کے بارے میں نہیں پوچھے گا کہ اعمال میں کیا کیا ہے؟ کیونکہ سارے اعمال شریعت سے ثابت ہوتے ہیں' لیکن توحید کے بارے میں اور اللہ کے وجود کی معرفت کے بارے میں سوال ہو جائے گا۔ اس کو شُکرالمُنعم سے تعبیر کرتے ہیں' یعنی شرک اگر کیا ہے' چاہے رسول کی دعوت پہنچی یا نہیں پہنچی، اگر شرک پر انسان کھڑا ہوا ہے تو ایسا شخص قیامت کے دن قابلِ گرفت ہے۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ عہدِ الست والی آیت، کیونکہ اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے عہد لیا کیوں ہے: ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ﴿۱۷۲﴾﴾ (الاعراف) ''مبادا تم قیامت کے دن یہ کہہ دو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں تھی!''

بہرحال یہ ایک دوسری رائے ہے اور یہ دونوں اہلِ سُنّت کی ہی آراء ہیں۔ دونوں طرف دلائل موجود

ہیں۔ یہاں تو مختصر بیان کر دیا گیا ہے' لہٰذا کسی ایک رائے پر نکیر نہیں کی جاسکتی۔ علمی مناقشہ تو کر سکتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ رائے زیادہ قوی ہے اور آپ کے نزدیک یہ رائے زیادہ قوی ہے' لیکن اس کو کوئی کفر و اسلام اور بدعت اور سُنّت کا مسئلہ نہیں بنایا جائے گا۔ ہمیں عقیدے میں یہ بات بھی سیکھنی چاہیے کہ کون سی باتیں ہیں جن پر ہم نے لڑنا مرنا ہے اور کون سی باتیں ہیں جن پر پیار محبّت سے گزر جانا ہے۔ ہمارے ساتھ آج کل کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہو رہا ہے کہ بہت سی باتیں پیار محبّت سے گزرنے والی ہیں اور وہاں ہم لڑتے مرتے رہتے ہیں۔ اور بہت سی باتیں لڑنے مرنے والی ہیں اور وہاں ہم پیار محبّت سے گزر جاتے ہیں۔ عقیدے کے جو اصول ہیں' جہاں اختلاف نہیں ہے وہ لڑنے مرنے والی باتیں ہیں' وہاں ہم کوئی سمجھوتا نہیں کریں گے۔ ہم نہیں مانیں گے کہ عقیدہ اہم نہیں ہوتا' جیسے کہ آج کل ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ اصل شے اخلاق ہوتی ہے' اصل شے تو حقوق العباد ہیں' یہ ادا کرو۔ عقیدہ کوئی جو بھی رکھے۔ نہیں! عقیدے پر تو بنیاد ہے۔ خدا کو پہچاننے' ماننے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بات ماننے پر سارا دارومدار ہے۔ اگر آپ مجدّد الف ثانی علیہ الرحمہ کے ''مکتوبات'' پڑھیں تو وہ ہر دوسرے چوتھے مکتوب کے شروع میں فرماتے ہیں: اپنے عقائد کو اہلِ سُنّت والجماعت کے عقائد کے مطابق درست کرلو' کیونکہ اسی پر تمام اعمال کی قبولیت کا دارومدار ہے۔ تو یہ بات اہم ہے' یہ بات ذہن میں رکھیے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم مانتے کیا ہیں؟ اور آج کل اصل حملہ تو اسی عقیدہ پر ہے۔ آج کے زمانے کا سب سے بڑا حملہ کس بات پر ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کی حتمیت اور قطعیت پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت قطعی ہے' تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے' تمام انسان آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کے مکلّف ہیں۔ لیکن اسی کو اب شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور لوگ مان بھی رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپس میں پیار محبّت سے رہنا چاہیے۔ پیار محبّت سے ہی رہنا ہے' لیکن اس بات پر کوئی سمجھوتا نہیں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعوت اب آخری دعوت ہے۔ ان شاء اللہ' یہ مباحث آگے آئیں گے۔

بہرحال یہ مبحث کس عنوان کے تحت تھا کہ جو غور و فکر کے نتیجے میں پتا چل رہا ہے ابھی رسول کی دعوت نہیں پہنچی تو وہ ہم پر واجب ہے کہ نہیں؟ ہم نے دیکھا کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ رسول آئے گا تو سب کچھ واجب ہوگا' پکڑ اس وقت ہوتی ہے' کچھ نے کہا کہ رسول نہ بھی آئے تو کچھ عقیدے کی باتوں پر پکڑ ہو جائے گی۔ تیسری رائے وہ ہے جو اہلِ سُنّت سے خارج رائے ہے یعنی معتزلہ کی۔ انہوں نے کہا کہ عقیدے کی بھی پکڑ ہوگی' اعمال کی بھی پکڑ ہوگی۔ یہ رائے بھی اہلِ اسلام میں سے ہی ہے' کیونکہ معتزلہ کافر نہیں ہیں۔ یہ اصل میں ایک مسئلہ حسن و قبح عقلی کے تحت رائے قائم کی گئی ہے کہ عقل سے حسن و قبح کتنا ثابت ہوتا ہے اور کتنا ثابت نہیں ہوتا اور انسان پر کتنی چیزیں واجب ہوتی ہیں۔ بہرحال ہم نے دیکھا کہ معرفت حاصل ہو سکتی ہے اور وہ معرفت ماتُریدیہ کے ہاں اللہ کی توحید کی معرفت واجب ہو جائے گی اور باقیوں کے ہاں واجب نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یا کسی بھی نبی کی دعوت کے ذریعے یہ پیغام واجب ہوگا۔

❁❁❁

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نام کتاب : ایمان کا راستہ

مصنفہ : نگہت ہاشمی

ضخامت:362 صفحات قیمت:400 روپے

ناشر : النور پبلی کیشنز ملنے کا پتہ: 59-C2 فیروز پور لنک روڈ' لاہور

امن وسلامتی کا سچّا اور حقیقی راستہ ایمان ہے اور ایمان ہی انسان کو زیب دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لاتعداد مخلوقات تخلیق کی ہیں' اشرف المخلوقات انسان ہے۔ یہ فضیلت اس شعور کی بنا پر ہے جو اسے عطا کیا گیا ہے اور جس کی مدد سے وہ نیک وبد' اچھائی بُرائی' حق اور ناحق' صحیح وغلط میں فرق جان سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پہچان کا نام ایمان ہے۔ انسان اللہ کی دی ہوئی عقل کے ساتھ سوچتا ہے کہ یہ کائنات کس نے بنائی ہے؟ انسان دوسرے جانوروں سے مختلف ہے کہ دیگر جانور بے شعور ہیں۔ انسان شعور کی قوت سے بڑے بڑے جسیم اور طاقتور جانوروں کو زیر کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے انسان کو بھی اللہ نے بنایا ہے۔ اُس اللہ کی پہچان کرنا ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں لاتعداد ہیں' جن کو دیکھ کر اور غور وفکر کر کے انسان خالق کی کبریائی اور عظمت کو پہچان لیتا ہے۔ یہی معرفتِ ربّ ہے۔ دیگر جانور معرفتِ ربّ سے عاری ہیں' اس لیے ان سے ایمان کا تقاضا نہیں۔ انسان جب معرفتِ الٰہی کے نتیجے میں غور کرتا ہے تو وہ اپنے خالق کو پہچان لیتا ہے اور اُس کا بندہ بن کر زندگی گزارنے کی اہمیت سے واقف ہو جاتا ہے۔ اللہ کی رضا اور ناراضگی بتانے کے لیے جو ہستیاں مبعوث ہوئیں انہیں نبی اور رسول کہتے ہیں۔ پس معرفتِ حق کے نتیجے میں انسان پیغمبروں پر ایمان لاتا ہے اور پیغمبروں کی تعلیم کے ذریعے نیکی اور بُرائی کے کاموں سے واقف ہوتا ہے۔ یہیں سے ایمان بالآخرت نصیب ہوتا ہے کہ ایک دن نیکوں کو نیکی کا انعام دیا جائے گا اور نافرمانوں کو سزا دی جائے گی۔ کتاب کی مصنّفہ معروف اسلامی سکالر ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے فہم وبیان کی جو صلاحیت دی ہے وہ اس کا بھرپور استعمال کر رہی ہے۔

ایمان کے راستے کی پہچان کے لیے اس کتاب میں چودہ ابواب میں بحث کی گئی ہے۔ ہر باب اپنے عنوان پر سیر حاصل معلومات فراہم کرتا ہے۔ چند عنوانات اس طرح ہیں: (۱) اللہ کا رنگ (۲) عظیم ذہنی سفر (۳) عقیدۂ آخرت سے زندگی کی تعمیر (۴) جنت کا سفر (۵) رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے راہنما ہیں (۶) قرآن انسانیت کے نام ربّ کا پیغام ہے۔

کتاب اعلیٰ سفید کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ سرورق خوبصورت' جلد مضبوط اور کمپوزنگ معیاری ہے۔

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-A'raf

(The Heights)

(The Faculty of Discernment)

(Recap of verses 145 – 165 of Surah 6, Al-An'am; Introduction to Surah 7, Al-A'raf; and exposition of verses 01 – 25 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Verse) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 145 – 165 (inclusive) of Surah 6, Al-An'am

This section of Surah 6, Al-An'am (verses 145 – 165) commences by elucidating that whatever Allah *(SWT)* has allowed in His *(SWT)* Divine Revelation to His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* is lawful and whatever He *(SWT)* prohibited is unlawful. However, regarding everything else which He *(SWT)* has not mentioned, there is not any sin in consuming it. Then Allah *(SWT)* mentions some of the things which He *(SWT)* has made unlawful for His *(SWT)* servants. Furthermore, it is elucidated that the Law of Allah *(SWT)* does not force anyone to eat everything which is not prohibited (which is lawful). At the same time, the Law does not entitle anybody to exalt his personal likes and dislikes into a criterion of what is lawful and unlawful. No one is justified in reproaching others for consuming lawful things which offend his tastes. The exception to the rule mentioned above is that in case of a 'life and death' situation, even the unlawful is allowed to be consumed, only to the extent that is sufficient to save life but with extreme dislike. In that case, Allah *(SWT)* may not consider it a transgression and forgive with His *(SWT)* infinite mercy. Furthermore, it mentions some of the food that Allah *(SWT)* had prohibited for the Jews because of their transgressions. The punch line is that whatever was forbidden for the Jews was due to their transgressions and served as a punishment for them.

The Holy Prophet *(SAAW)* is commanded that if the disbelievers and your *(SAAW)* enemies deny you *(SAAW)*, then tell them that your Lord *(SWT)* is Infinite in His *(SWT)* Mercy, thus encouraging them to repent and to follow you *(SAAW)*. But in spite of this encouragement if they still keep denying you (SAAW), warn them that, His *(SWT)* scourge and wrath will never be averted from them. Allah *(SWT)* decrees that the claims made by the disbelievers are similar to the claims and excuses of those who denied His *(SWT)* revelations and committed polytheism from amongst the previous nations. They were destroyed by Him *(SWT)* for their transgressions and He *(SWT)* made them taste tormenting punishment. Allah *(SWT)* declares that such people who deny only follow conjectures and falsehood, but in reality, they do not have any knowledge or proof for their false claims. It further

elaborates the response to the false arguments made by the disbelievers and alludes to the fact that Allah *(SWT)* does what He *(SWT)* wills, therefore, if He *(SWT)* would have willed He *(SWT)* could have guided all of them to faith but He *(SWT),* in His *(SWT)* perfect Wisdom, has given to man the freedom of choice and action as a trial in this world. Allah *(SWT)* has helped him to find the right path by sending His *(SWT)* Messengers *(AS)* and His *(SWT)* revelations. Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* to tell the idolaters to bring forth their witnesses who can testify that Allah *(SWT)* did indeed forbid that they have forbidden to themselves. Allah *(SWT)* further instructs His *(SWT)* Prophet *(SAAW)* to inform his *(SAAW)* companions not to follow the false desires of the idolaters, who make a mockery of Allah's *(SWT)* revelations, disbelieve in the Hereafter and associate others with Allah *(SWT)* in worship.

Allah *(SWT)* then instructs His Messenger *(SAAW)* to tell the idolaters to come along so that he *(SAAW)* may recite to them things which Allah *(SWT)* has made unlawful for them.

The first principle or commandment mentioned is that they should associate none with Allah *(SWT)* in His *(SWT)* divinity: neither in His *(SWT)* essence, nor in His *(SWT)* attributes, nor in His *(SWT)* powers and authority, nor in the rights He *(SWT)* has against His *(SWT)* creatures.

The second principle or commandment mentioned is that one must ensure good treatment of one's parents, which includes showing them respect and reverence, obeying them, trying to keep them pleased, and serving them.

The third principle or commandment mentioned is that Allah *(SWT)* made it unlawful to kill one's children from fear of poverty because it is He *(SWT),* Who *(SWT)* is responsible for feeding and providing provision for their children and not them.

The fourth principle or commandment mentioned is to avoid *'fawahish.'* The word *fawahish* applies to all those acts whose abominable character is self-evident. In the Qur'an all extra-marital sexual relationships, sodomy, nudity and false accusations of un-chastity are specifically reckoned as 'shameful deeds' *(fawahish).* In

Hadith, theft, taking intoxicating drinks and begging have been characterized as *fawahish*, as have many other brazenly indecent acts. Man is required to abstain from them both openly and in secret.

The fifth principle or commandment mentioned is that it is unlawful to take the life of another human being, unless there is a clear exception (just cause) mentioned in the Qur'an and the Ahadith. This means that human life, which has been declared inviolable by Allah *(SWT)*, can only be destroyed for just cause. As for what is meant by 'just cause', we ought to remember these cases are embodied in the Qur'an and the Ahadith.

The sixth principle or commandment mentioned is that Allah *(SWT)* commands those guardians who have taken orphans into their care that they ought not to do injustice to the wealth that belongs to the orphans and that they should not take from it or eat from it unlawfully.

The seventh principle or commandment mentioned is to be just while giving and taking. This means that the giver should not decrease anything from what is due to be received by the other person and the receiver should not take anything more than what he has to receive from the giver.

The eighth principle or commandment mentioned is that there should be justice in action and statement, which implies that whether it is a witness statement given, a testimony, a judgment or a ruling, one should always abide by the truth and justice even if it is against one's own relatives and friends.

Thereafter, Allah *(SWT)* decrees by commanding His *(SWT)* servants to fulfill all their covenants and treaties, made with Him *(SWT)*, which means that they ought to refrain from what He *(SWT)* has prohibited and take what He *(SWT)* has permitted, and have faith in His *(SWT)* Prophets *(AS)* and follow them *(AS)*, and He *(SWT)* also commands His *(SWT)* servants to fulfill those covenants and treaties made with their fellow beings. Thus, these are the commandments which He *(SWT)* has emphasized for humans so that they may observe the Divine guidance and follow His *(SWT)* path. Allah *(SWT)* declares that the

principles and the commandments mentioned above are the guide to His *(SWT* 'Straight Path. Allah *(SWT)* commands to His *(SWT)* servants that this is the only straight path – Islam – which is heading towards the required destination thus follow it and adhere to it. Allah *(SWT)* forbids them to cause divisions and disputes within their religion, thus ordaining that they ought not to follow different ways on their own, otherwise whoever walks these ways shall go far away from His *(SWT)* path. Moreover, it is also declared that when man follows the "Straight Path" of Allah *(SWT)* sincerely, only then can he attain the righteousness.

Allah *(SWT)* states that He *(SWT)* revealed His *(SWT)* Book, The Torah, to His *(SWT)* Prophet Moses *(AS)* as guidance for the Children of Israel and thus to complete His *(SWT)* favour on those who would do good to others. He made the Torah a complete and a comprehensive Book, explaining all details needed to complete and follow His *(SWT)* law. Furthermore, Allah *(SWT)* told them that He *(SWT)* made this Book as a guidance and Mercy for them, so that they come to believe in the Hereafter and thus do righteous deeds. Allah *(SWT)* then pronounces that after giving Torah to Prophet Moses *(AS)*, He *(SWT)* revealed this Final and Most Complete revelation, The Glorious Qur'an to the Last of the Prophets, Prophet Muhammad *(SAAW)*. In this verse Allah *(SWT)* ordains His *(SWT)* believers to follow this Book – the Noble Qur'an. He *(SWT)* decrees for them to adhere to it by not disobeying His *(SWT)* orders, and commands them to call others to it, for He *(SWT)* will bestow His *(SWT)* mercy on those who follow and practically implement its commands in their lives, individually and collectively. They will be saved from the torment of Hell. The allusion made in certain verses is to the Jews and Christians, while those being directly addressed are the Pagan Arabs to whom Allah *(SWT)* sent His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* from among them and revealed the Glorious Qur'an to him *(SAAW)* in their own language, so that these idolaters have no excuse that no Book was given to them as were given to the Jews and the Christians, namely the Torah and the Gospel. Thus they would be unable to claim that they were unaware of the message as they did not receive or understand it. The Pagan Arabs are also

directly addressed and told that they would not be able to use the excuse, on the Day of Judgement, for not following the Islamic Monotheism and say that if they would have been given the Book they would certainly have followed it better than the Jews and the Christians. It is clearly elucidated that the reason is that Allah *(SWT)* showed them His *(SWT)* signs and sent to them the Last of His *(SWT)* Messengers *(AS)* bringing clear guidance and mercy for all mankind. Thereafter, those who reject Islam and do not follow Prophet Muhammad *(SAAW)*, rather they turn their backs on the revelation brought by the Holy Prophet *(SAAW)* and hinder others from following it, are told emphatically that they are unjust, meaning that they are unbelievers. It is then told that such people who turn away from the revelations of Allah *(SWT)* will face a dreadful punishment for their aversion from the truth on the Day of Judgement.

Note:

These statements about the Final Book and Last of the Prophets *(AS)* is supported as follows:

a. Al-Ana'm: 155,156
b. Al- Maidah: 19
(Bayan ul Quran, Volume 2, 3)

Therefore, Allah *(SWT)* states that what else are they waiting for before they would embrace Islam? Are these disbelievers waiting for the angels to come down to them or they are waiting for the Day of Judgment when Allah *(SWT)* will descend and will decide their fate or are they waiting to see the last of the signs from their Lord *(SWT)* for the coming of the Hour? Allah *(SWT)* portends the disbelievers that as soon as the signs of the Hour appear, it will not be possible for them to accept faith and all doors of repentance will be closed for them. Therefore, whenever the 'tokens' of the approach of the Day of Reckoning or Allah's *(SWT)* scourge or any other sign that will uncover the Truth appears, after that there will be no reason left for testing man. Those tokens will be so clear that after their appearance it will neither avail the unbeliever to repent of his unbelief nor the disobedient to forsake his disobedience. For faith and obedience have meaning and value only as long as the Truth remains hidden,

as long as the tenure of life granted to people does not seem to have approached its end and the world with all its vanities continues to delude the disbelievers that, as there may 'neither be Allah *(SWT)* nor After-life', one should eat, drink and enjoy oneself as best one can. Allah *(SWT)* decrees that those who do not follow the Straight Path of their Lord *(SWT)* and divide their religion, into sects, following their desires and misguidance have fallen into the ways of error and innovations. Then Allah *(SWT)* addresses the Holy Prophet *(SAAW)* that he *(SAAW)* has nothing to do with these disbelievers and innovators, for their case is in Allah's *(SWT)* hands and it is He *(SWT)* Who *(SWT)* will punish them on the Day of Judgment for all evil that they used to commit.

Thereafter, Allah *(SWT)* elucidates the modus operandi of reward and punishment in the Hereafter from the Most Exalted *(SWT)* and Most Merciful *(SWT)*. A person (provided that he is a Muslim) who does one good deed will get ten times more in return and a person who commits one sin, then the return for him will be equal to that of one sin.

Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Prophet *(SAAW)* to proclaim to the disbelievers that he *(SAAW)* has not taken this Straight Path (the path of Allah *(SWT)*) under ancestral customs or for some other personal reasons. Instead, this is the 'way' to which he *(SAAW)* has been directed by Allah Himself *(SWT)*. This is the true religion established on firm grounds which has also been the religion of all the previous Prophets *(AS)*, including Prophet Abraham *(AS)*, who always abstained from worshipping anyone other than Allah *(SWT)*. The 'Way of Abraham' is one further indication of the way of the True Religion which one is required to follow. Allah *(SWT)* alludes to the logical outcome of perfect faith and sincerity towards Allah *(SWT)*, which is, that one admits that all his prayers, his sacrifices, his life and his death are all only for Him *(SWT)* Who *(SWT)* is the Lord *(SWT)* of the Worlds and Who *(SWT)* has no associate or partner. Thereafter, the Holy Prophet *(SAAW)* is commanded to declare to the people (believers and disbelievers alike) that Allah *(SWT)* has no associate or partner, and that whatever he *(SAAW)* is declaring has been decreed by Allah *(SWT)*. The Holy Prophet *(SAAW)* is also directed to declare to people

(believers and disbelievers alike) that he *(SAAW)* is the first of Muslims (followers of Islam) from his *(SAAW)* Ummah, because the first believer from every Ummah has been the Prophet *(AS)* sent to an Ummah.

Allah *(SWT)* instructs His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* to ask the disbelievers and idolaters that do they want him *(SAAW)* to be like them who seek help and protection from deities other than Allah *(SWT),* despite the fact that it is He *(SWT)* Who *(SWT)* has created all things and hence there can be no other Allah except Allah *(SWT)* by that reason alone. Allah *(SWT)* then proceeds to declare that the sins of a person will be written against his record of deeds only and it will be he who will bear the brunt and get the punishment for his transgressions in the Hereafter. Allah *(SWT)* will surely inform every single being of his deeds and He *(SWT)* will deliver His *(SWT)* verdict regarding the differences in faith among the believers and the disbelievers on the Day of Judgement. Of course, it is implied that the believers will succeed on that day, while the disbelievers will fail miserably and suffer the eternal consequences.

The section of the Surah (and the Surah itself) concludes by elucidating that Allah *(SWT)* has made generations of people coming after generations, replacing each other on the earth as the inheritors. It is then expounded that Allah *(SWT)* has positioned different ranks and degrees amongst His *(SWT)* servants in terms of authority and wealth by making one poor while the other rich, one lacking in one way while the other superfluous in another, in order to test them in this worldly life whether they show gratitude and obedience or ingratitude and disobedience towards Him *(SWT)*. It is decreed that Allah *(SWT)* is very swift in taking account of those who disbelieve in Him *(SWT)* while He *(SWT)* is Forgiving and Merciful for His *(SWT)* believing servants.

==========

Introduction to Surah 7, Al-A'raf

Name

This Surah takes its name from verses 46 – 47 in which mention of *A'raf* ('The Heights' **or** 'The Faculty of Discernment') occurs.

Period of Revelation

A study of the contents and message of Surah *Al-A'raf* clearly shows that the period of its revelation is about the same as that of Surah *Al-An'am,* i.e., the last year of the Holy Prophet's *(SAAW)* life in Makkah, but it cannot be asserted with certainty which of these two was sent down earlier. Anyhow the manner of its admonition clearly indicates that it belongs to the same period.

Topics of Discussion

Surah *Al-A'raf* is the largest Makkan Surah in the Holy Qur'an with 24 rukus and 206 verses. It forms a pair with Surah *Al-An'am* with respect to the topics and subjects under discussion.

This Surah mostly deals with the subjects which are related to the Hereafter, punishment of the Hellfire and Prophethood. Between the first and the sixth discourse the subject under discussion is the return to Hereafter. Here the people of Makkah have also been given a warning about the consequences of their wrong attitude and are being admonished to accept the message that Prophet Muhammad *(SAAW)* has been sent with. At the time this Surah was being revealed the Prophet *(SAAW)* was about to migrate from Makkah to Madinah, thus the concluding portion of this address has been directed towards the People of the Book with whom he *(SAAW)* was going to come into contact at Madinah. This section of the Surah up till the twenty first section gives a detailed discussion of the past Prophets *(AS)*, their communities and the punishments that overtook them. During the course the Jews have also been warned of the consequences of their hypocritical attitude towards the Prophets *(AS)*, for they professed to believe in Prophet Moses *(AS)* but they not only disobeyed him *(AS)* but in fact worshipped falsehood.

At the end of the Surah, Allah *(SWT)* has given some instructions to the Holy Prophet *(SAAW)* and his *(SAAW)* followers to show patience in dealing with their enemies and are advised to be very careful and not take any step that might harm their cause.

==========

Expositionof verses01 – 25 of Surah Al -A'raf

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

In the Name of Allah, the Most Beneficent, the Most Merciful

Verse 01

الٓمّٓصٓ ۚ﴿۱﴾

"Alif, Laam, Meem, Sād."

These letters are known as *al-huruf-ul-muqatt'aat* They are fourteen in number and appear in the beginning of twenty-nine Surahs of the Qur'an. Although many opinions have been raised about these letters, the general consensus is that these are among the things, the knowledge of which Allah *(SWT)* has kept with Himself *(SWT)* exclusively. Some of these Surahs begin with a single letter like Qaaf, while others with two, three or four letters, with Surah Maryam starting with five letters, viz. 'Kaf-Ha-Ya-Ain-S ād'. This Surah, Al-A'raf, begins with four letters *(al-huruf-ul-muqatt'aat) "Alif Lam Mim Sād"*.

Verse 02

کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ مِّنۡہُ لِتُنۡذِرَ بِہٖ وَ ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾

"[This is] a Book revealed to you, [O Muhammad]- so let there not be in your breast distress therefrom- that you may warn thereby and as a reminder to the believers".

The verse commences with the profound and unequivocal declaration that this Qur'an is the Book of Allah *(SWT)*, sent down (revealed) to the Messenger *(SAAW)* of Allah *(SWT)* – Muhammad *(SAAW)*.

In the verse, Allah *(SWT)* commands His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* not to feel constraint in his *(SAAW)* heart nor hesitate in conveying the Qur'an and warn people with it. This verse does not mean that the Prophet *(SAAW)* had any doubts about the Qur'an; rather the constraint experienced by him *(SAAW)* was because of the affectionate concern for his *(SAAW)* people. That is why he *(SAAW)* felt pain when his *(SAAW)* people would not believe even after listening to the Holy Qur'an. Instead, they would deny him *(SAAW)* mockingly and ridicule

Allah's *(SWT)* revelations. Thus, in this verse Allah *(SWT)* comforts His *(SWT)* Prophet *(SAAW)* by instructing him *(SAAW)* that his *(SAAW)* only duty is to remind them of Allah's *(SWT)* Message and warn them with this Qur'an and that it is not his *(SAAW)* responsibility or obligation to see and ensure who becomes a Muslim and who rejects faith.

The Prophet *(SAAW)* is, thus, directed to preach his *(SAAW)* Message without fear and hesitation, and to disregard his *(SAAW)* opponents' response. Such opponents may well be offended by his *(SAAW)* preaching of the Message, or may, hold it to ridicule, or go about maliciously twisting it, or acting with greater hostility. All this notwithstanding, the Message of Islam must be preached.

Verse 03

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

"Follow, [O mankind], what has been revealed to you from your Lord and do not follow other than Him any allies. Little do you remember."

This verse addresses the mankind to follow the commandments of the Qur'an. It also cautions them not to follow those who order them to disregard the Messenger *(SAAW)* or tell them to associate partners with Allah *(SWT)*.

The central theme of the whole Surah, and of the present discourse, is the guidance which man needs in order to live a wholesome life, the knowledge which he requires in order to understand the reality of the universe and his own being and the purpose of his existence; the principles which he needs to serve as the basis for morality and social life as well as culture and civilization. In this regard man should look to Allah *(SWT)* alone and follow exclusively, the Guidance which He *(SWT)* has communicated to mankind through His *(SWT)* Messenger *(SAAW)*. To look to anyone other than Allah *(SWT)* is perilous for it has always spelled disaster in the past, and will always spell disaster in the future.

Verse 04

مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَاۗءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَاۗىِٕلُوْنَ ۝

"And how many cities have We destroyed, and Our punishment came to them at night or while they were sleeping at noon.

This is the main theme of this Surah, i.e., warning the unbelievers about the consequences of their denial through examples of punishments inflicted upon former generations for their wrong attitude and behaviour towards Allah's *(SWT)* Messengers *(AS)* and His *(SWT)* Message.

Verse 05

كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝٥

"And their declaration when Our punishment came to them was only that they said, "Indeed, we were wrongdoers!"

This verse continues the message from the previous one and elaborates that those who were wrongdoers and transgressors, when Allah *(SWT)* inflicted torment upon them, their only cry was that they admitted their sins saying that they were on the wrong path. However, it was too late at that point for them to seek redemption.

People can learn a lesson from the tragic fate of those nations that spurned Allah's *(SWT)* Guidance and instead followed the misguidance of others; and they became so degenerated that their very existence became an intolerable burden on the earth. Eventually, Allah's *(SWT)* scourge seized them and the earth was cleansed of their filthy existence.

The words uttered by the evil-doers: 'We are indeed transgressors', emphasize two points. First, that it is pointless for one to realize and repent of one's wrong-doing after the time for such repentance is past. Individuals and communities who allow the term granted to them to be wasted in heedlessness and frivolity, who turn a deaf ear to those who invite them to the truth, have so often been overtaken in the past by Allah's *(SWT)* punishment. Second, there are numerous instances of individuals as well as communities which incontrovertibly prove that when the wrong-doings of a nation exceed a certain limit, the term granted to it expires and Allah's *(SWT)* punishment suddenly overtakes it. And once a nation is subjected to Allah's *(SWT)* punishment,

there is no escape from it. Since human history abounds in such instances, there is no reason why people should persist in the same iniquity, and repent only when the time for repentance has passed.

Verse 06

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴿۶﴾

"Then We will surely question those to whom [a message] was sent, and We will surely question the messengers".

This verse indicates that on the Day of Resurrection, Allah *(SWT)* will ask His *(SWT)* servants as how did they treat His *(SWT)* Messengers *(AS)* and how did they respond to the Messages that He *(SWT)* sent them with. Similarly, the Messengers *(AS)* will also be questioned if they *(AS)* had delivered His *(SWT)* Message to their people or not. That is why at the Farewell Hajj (Pilgrimage) the Prophet *(SAAW)* kept raising his finger towards the sky saying: "O Allah *(SWT)*! Did I convey? O Allah *(SWT)*! Did I convey?" and his Companions *(RA)* replied: "We bear witness that you have conveyed". Hence it means that a Prophet *(AS)* as Allah's *(SWT)* representative will bear witness to the fact that he *(AS)* conveyed the message to his *(AS)* people.

Holy Prophet *(SAAW)* directed those present there with him *(SAAW)* to pass on the message on to those who were not there. Hence the Muslims are duty bound to convey the message to the rest of the Mankind.

The words 'call to account' refers to questioning the mankind will be subjected to on the Day of Judgement. For, it is the reckoning on the Day of Judgement that really matters. Punishment dealt upon corrupt individuals and communities in this world does not constitute their true punishment. Punishment in this world is no more than what happens when a criminal, who has been strutting scot-free, is suddenly arrested. The arrest constitutes no more than depriving the criminal of the opportunity to perpetrate further crimes. The annals of history are filled with instances where corrupt nations have been punished; proving that man has not been granted absolute licence to go about doing whatever he pleases. Rather, there is a Power above all that allows man to act freely but only to a

certain extent, no more. And when man exceeds those limits, that Power administers a series of warnings in order that he might heed the warnings and give up his wickedness. But when man fails totally to respond to such warnings, he is punished.

Anyone who considers the events of history will conclude that the Lord *(SWT)* of the universe must have certainly appointed a Day of Judgement in order to hold the wrong-doers to account for their actions and to punish them. This shows that on the Day of Judgement, "Prophethood" will be the main basis of reckoning. On the one hand, the Prophets *(AS)* will be questioned about the efforts they made to convey Allah's *(SWT)* Message to mankind. On the other hand the people to whom the Prophets *(AS)* were sent will be questioned about their response to the message. The Qur'an is not explicit about how judgements will be made with regard to individuals and communities who did not receive Allah's *(SWT)* Message. It seems that Allah *(SWT)* has left judgement – to borrow a contemporary judicial expression – reserved. However, with regard to individuals and communities who did receive Allah's *(SWT)* Message through the Prophets *(AS)*, the Qur'an states explicitly, that they will have no justification whatsoever to put forward a defence of their disbelief and denial, of their transgression and disobedience. They are doomed to be cast into Hell in utter helplessness and dejection.

Verse 07

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ كُنَّا وَّمَا غَآئِبِيْنَ ۝

"Then We will surely relate [their deeds] to them withknowledge, and We were not [at all] absent".

This verse refers to the Book of deeds, which will be placed before every human being on the Day of Resurrection and they all will find every iota of deed that they did during their corporeal life therein. Allah *(SWT)* is Omnipotent, Omnipresent and Omniscient; hence, He *(SWT)* knows ALL.

Verse 08

وَالْوَزْ يَوْمَئِذٍ اِفَمَنْ لْحَقُّ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ هُمُ لٰٓئِكَ فَاُو الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"And the weighing [of deeds] that Day will be the truth. So those scales are heavy – it is they who will be the successful."

This verse indicates that the weighing of good and bad deeds on the Day of Judgment is true and, on that Day, whoever has his good deeds 'heavier' he will surely be admitted into Paradise – the ultimate abode for those who are successful.

This means that when the Balance is fixed on the Day of Judgement, 'truth' and weight will be identical. The more truth one has to one's credit, the more the weight in one's scale; and vice versa. One will be judged solely on the basis of this weight. In other words, no consideration other than truth will enter into the calculation. A life of falsehood, however long it lasted, and however full of worldly achievements, will carry no weight at all. Weighed in the Balance, the devotees of falsehood will discover that their life-long deeds do not even weigh so much as a bird's feather.

Verse 09

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ﴿٩﴾

"And those whose scales are light – they are the ones who will lose themselves for what injustice they were doing toward Our verses."

Continuing with the subject of the previous verse, this verse declares that on the other hand, those who will find their scale lighter, due to being lacking in good deeds and aplenty with evil deeds, then they shall find themselves in loss for they had disbelieved in Allah's *(SWT)* revelations.

For a full appreciation of this point, it is necessary to remember that man's deeds will be classified into positive and negative categories. The positive category will consist of knowing the truth, believing in it, acting upon it, and striving to make it prevail. These acts alone will have weight in the Hereafter. Conversely, whenever someone follows and goes after lusts or blindly follows other humans or satans, his acts will be reckoned as 'negative'. Such acts will not only be of no value at all, but will also have the effect of reducing the total weight of one's positive acts.

Thus, a man's success in the Hereafter requires that his good acts outweigh his evil ones to such an extent that even if his evil acts cause the effacement of some of his good acts, he should still have enough left in his credit to ensure his scale is inclined towards the positive. As for the man whose evil acts outweigh his good acts, he will be like the bankrupt businessman who, even after spending all his assets, remains under the burden of debt.

Verse 10

لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

"And We have certainly established you upon the earth and made for you thereinways of livelihood. Little are you grateful."

Allah *(SWT)* has blessed mankind with ownership and control on this earth. He *(SWT)* has made this earth as a place of comfort and as a means of provision for His *(SWT)* servants, so that they should show gratitude to their Lord *(SWT)*. But human beings are prone to ingratitude and heedlessness and most of them show little gratitude to Him *(SWT)*. This verse pronounces this bitter truth.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

بقیہ: حرفِ اوّل

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے علومِ دینیہ کا احیاء اور اتّباعِ شریعت کی روح کو تازہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ پچھلی صدی کے نصف اوّل میں عالَمِ اسلام کے علمی مرکز مصر کے کئی دانشوروں کو مغربی جدیدیت کی لہر نے متاثر کیا' جن میں استاذ محمود عقاد' محمد حسین ہیکل پاشا اور محمد عبدہٗ زیادہ مشہور ہیں۔ ان حضرات نے نبی اکرم ﷺ کو صرف عبقری' اعلیٰ منتظم اور انقلابی لیڈر کے طور پر پیش کیا اور اس طرح نبوت کے مجمع علیہ خصائص اور بنیادی وظائف پس منظر میں چلے گئے' جس میں انسانیت پر اتمامِ حُجّت اور آخرت سنوارنے کا عمل سب سے اوّلین ہے۔ مصر کی طرح برصغیر پاک و ہند کے جدیدیت گزیدہ مسلم مفکّرین کے رد کے لیے سلطنتِ عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام شیخ مصطفیٰ صبری آفندی (متوفی ۱۹۵۴ء) نے پُرمغز دلائل سے بھرپور کتاب ''القول الفصل....'' میں نبوت کو عبقریت میں تحلیل کرنے کی سعی کو بے نقاب کیا اور نبی ﷺ کی حیثیت بطور ہادی اور مصلح واضح کی' جن کی تعلیمات اور اسوہ کو نہ صرف تسلیم کرنا بلکہ احوالِ قلوب بنا کر عمل میں لانا مدارِ نجات ہے۔ ❁❁❁

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند فکر انگیز تالیفات

قرآن حکیم کی عظمت و تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآنِ حکیم اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

عظمت مصطفیٰ ﷺ، مقصد بعثت، اسوۂ رسول ﷺ اور
سیرت نبویؐ کے انقلابی پہلوؤں پر مشتمل مقالات کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے ، اشاعت عام 350 روپے

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب
کے مراحل و مدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 500 روپے، غیر مجلد 300 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب
کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت و فرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

اشاعت خاص 225 روپے، اشاعت عام 150 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دور حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

اشاعت خاص 125 روپے، اشاعت عام 70 روپے

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت

سُورۃُ الحَدید

(اُمُّ المُسَبِّحات) کی مختصر تشریح

اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 150 روپے

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 180 روپے

مکتبہ خدام القرآن
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
فون 3-35869501 (042)
ای میل maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ www.tanzeem.org

Quarterly HIKMAT-E-QURAN Lahore
Jan - Mar 2021 Vol. 40 No. 1

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ——— اور ——— غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ